بیگم نظیر افتخار

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر عرش صدیقی
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر عرش صدیقی
شخصیت اور فن

بیگم نظیر افتخار

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	:	فخر زمان
منتظم	:	محمد عاصم بٹ
تدوین وطباعت	:	سعیدہ درانی
اشاعت	:	2010
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	کلاسیک 042-37312977
قیمت	:	مجلد:-/220
		غیر مجلد:-/210

ISBN: 978-969-472-255-9

Dr.Arsh Siddiqi

Pakistani Adab Ke Mamar

"Shakseyat-our-Fun"

Compiled By

Begam Nazir Iftikhar

Publisher

Pakistani Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی وادبی کام اور اُن کی حیات کے بارے میں معلومات کو کتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے، جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔

ڈاکٹر عرش صدیقی اردو اور پنجابی ادب کا بے حد معتبر نام ہے۔ آزاد نظم، غزل، دوہا نگاری، افسانہ نگاری، تنقید اور پنجابی کی کلاسیکی روایت میں جن شعراء کے نام آتے ہیں ان میں ڈاکٹر عرش صدیقی کا نام معتبر حوالہ ہے۔ وہ دوہے کے میدان میں جداگانہ اسلوب کے حامل ایسے شاعر ہیں جنھیں الگ شناخت کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ادبی حوالے سے ادب کی بہت ساری اصناف میں اپنی ایک علیحدہ پہچان بنائی ہے۔

اس اشاعتی منصوبے کی پیش نظر کتاب "ڈاکٹر عرش صدیقی: شخصیت اور فن" اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر معروف محقق بیگم نذیر افتخار صاحبہ نے تالیف کی ہے۔ اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری، ڈاکٹر عرش صدیقی کی شخصیت اور فن سے بہتر طور پر آگاہ ہوسکیں گے۔

یہ کتاب ڈاکٹر عرش صدیقی کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہے۔ امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے "پاکستانی ادب کے معمار" سلسلے کی کتاب "ڈاکٹر عرش صدیقی: شخصیت اور فن" کو ملک اور بیرون ملک یقیناً پسند کیا جائے گا۔

فخر زمان

پیش لفظ

ادب بچپن ہی سے میرے مزاج کا ترجمان رہا ہے۔ یہ روایتی جملہ نہیں، مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ میری پرورش جس گھر میں ہوئی وہاں کلاسیکی شعرا کے کلیات، عظیم شخصیات کی سوانح عمریاں اور مختلف نوع کے ڈائجسٹ وافر مقدار میں موجود تھے۔ عالمی فکشن کے نمائندہ ادیبوں کی تحریروں کے تراجم میں نے ابتدائی طور پر ڈائجسٹوں میں ہی پڑھے۔ میرے بھائی اورنگزیب اور انجینئر فدا حسین شعر و ادب کے رسیا تھے۔ استاد قمر جلالوی کے شاگرد اور کئی شہرہ آفاق غزلوں اور گیتوں کے تخلیق کار حضرت پرنم الہٰ آبادی اکثر ہمارے مہمان خانے کے مکین ہوتے۔ ہمارے گھر کی بیٹھک میں مختلف سیاسی شخصیات کا آنا جانا رہتا تھا۔ جناب اجمل خٹک اور جناب عابد حسن منٹو جیسے قومی سطح کے سیاست دان میں نے پہلی دفعہ اپنے گھر کے مہمان خانے میں دیکھے۔ ہمارا گھر درگاہ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ (پاک پتن) سے متصل ہونے کی وجہ سے اردو اور پنجابی کے اس عظیم شاعر کے کئی دوہے آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہیں کیونکہ یہ ہمارے بزرگوں کی روزمرہ گفتگو کا موضوع ہوتے تھے۔

میرے میکے کے پڑوس میں ہی میرے چچا ظہور حسین ظہور مرحوم مقیم تھے۔ وہ پنجابی کے منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔ ان کے شعری مجموعے ''کوڑے گھٹ'' اور ''کونجاں وس کرلاون'' منظر عام پر آ کر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ میرے خاندان میں ہی ایک معتبر نام ماموں میاں اللہ بخش طارق کا ہے جنہوں نے پاک پتن کی تاریخ لکھ کر اس شہر کی ازسرِ نو دریافت کا کام کیا۔ سسرالی گھر میں بھی میرا سامنا کتابوں سے ہی ہوا کہ میرے ہمسر گرامی پروفیسر افتخار شفیع ایک شاعر، ادیب

اور محقق ہیں۔ ایم اے اردو میں داخلہ لینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ادیب بننے کے لئے درکار ہوتی ہیں۔ سو آغاز میں میں نے کچھ مضامین لکھے جو ملک کے اہم ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ عالمی ادب سے کچھ افسانے اردو میں ترجمہ کیے۔ اس کے علاوہ میری ''سیرت النبیؐ'' کے موضوع پر ایک کتاب بھی زیر طبع ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے جب مجھے ''ڈاکٹر عرش صدیقی۔ شخصیت اور فن'' کے موضوع پر کام کرنے کو کہا گیا تو مجھے خاصی دقت ہوئی لیکن اس مرحلے پر افتخار شفیع میرے رہنما بنے۔ کتاب کی تصنیف کے مراحل میں ملتان میں قیام پذیر معروف افسانہ نگار اور محقق محترمی جاوید اختر بھٹی نے قابل قدر تعاون فرمایا۔ اس سلسلے میں مکرمی پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی کی کتاب ''دنیائے ادب کا عرش'' نے میرے لیے بنیادی متن کا کام دیا۔

میں مکرمی و محترمی جناب فخر زمان (چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان) کی مشکور ہوں جنہوں نے مجھے یہ کام کرنے کا موقع عطا کیا۔ ان سے پہلے لوگوں کی ''جراحتِ قلب'' کا کام بے ہوش کیے بغیر کیا جاتا تھا لیکن انہوں نے مجھ جیسے بے شمار لوگوں کی ''تالیف قلب'' کا اہتمام کیا۔ ان کا یہ کام ''پرورشِ لوح و قلم'' والی بات کی طرح ہے۔ میں محترمہ سعیدہ درانی صاحبہ کی ممنون ہوں جنہوں نے ہر مرحلے پر میرے ساتھ قابل قدر تعاون کیا۔

میرے بیٹے احمد افتخار، مہر علی اور حمزہ افتخار اس دوران اپنی طفلانہ اور معصومانہ شرارتوں سے مجھے محظوظ کرتے رہے میرے دل میں ان کے لئے ڈھیروں دعائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کام کو قبولیت عام عطا فرمائے۔ (آمین)

بیگم نظیر افتخار

ڈاکٹر عرش صدیقی ...... حیات اور ادبی کارنامے

ارشاد الرحمٰن عرش صدیقی 21 جنوری 1927ء کو گورداس پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم دھرم سالہ، گورداس پور، جوگندر نگر (کانگڑہ) اور لدھیانہ میں حاصل کی۔ 1955 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ دسمبر 1955ء سے اکتوبر 1975ء تک محکمہ تعلیم پنجاب میں انگریزی کے استاد رہے۔ اکتوبر 1975ء سے 1978ء تک بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کے پہلے چیئرمین اور بعد میں 1990 تک رجسٹرار رہے۔ 1991 میں انہوں نے ورلڈ یونیورسٹی اری زونا امریکہ سے ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ انہیں اکادمی ادبیات کی تاحیات فیلوشپ سے بھی نوازا گیا۔ 9 اپریل 1997 کو ملتان میں انتقال ہوا۔

ڈاکٹر عرش صدیقی ایک شگفتہ اور مرنجاں مرنج قسم کی شخصیت کے مالک تھے انھوں نے ملتان جیسے تہذیبی اور ادبی شہر میں شعر و ادب کے فروغ کے لیے نہایت بے پایاں خدمات انجام دیں

اپنے بچپن کے بارے میں انھوں نے "میزان" ملتان کو انٹرویو دیتے ہوئے کچھ یوں بتایا:

"اس زمانے میں سکولوں میں ہندی لازمی تھی۔ میں نے ابتدائی تعلیم کانگڑہ سے حاصل کی۔ کتابیں پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ جو کتابیں سب سے پہلے پڑھیں ان میں رامائن اور مہا بھارت سرفہرست ہیں۔ اس وقت گھروں میں قصص الانبیاء قسم کی کتابیں ہوتی تھیں۔ وہ بھی پڑھ لیں۔ ساتویں جماعت تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

ماحول کوئی خاص نہ تھا۔ تو اسے آپ اتفاق ہی سمجھ لیں۔ میرے تایا کا ایک بیٹا جو بھوانی شہر میں رہتا تھا اس کی ایک لائبریری تھی وہاں پہلی کتاب ''طلسم ہوشربا'' پڑھی اس نے ذہن میں انقلاب برپا کر دیا۔ وہیں سے ''فسانہء آزاد'' اور دوسری کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ بعد ازاں والد صاحب کی تبدیلی لدھیانہ ہو گئی۔ چنانچہ وہاں جماعت نہم میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت فرسٹ ڈویژن کا انعام دس روپے تھا۔ جب میں نے کالج میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی تو مجھے دس روپے انعام میں ملے۔ میں کتابوں کی دکان پر چلا گیا۔ وہاں اختر شیرانی کی کتاب پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھا کر کھولی تو اس میں یہ نظم دیکھی۔ او! دیس سے آنے والے بتا! کس حال میں ہیں یاران وطن۔ میں نے وہ خریدی۔ یوسف ظفر کی کتاب ''زندان'' احسان دانش کی دو کتابیں اور اصغر گونڈوی کی ایک کتاب خرید لی۔ باقی جو پیسے بچے ان سے علامہ اقبال کی کتابیں خرید لیں۔ اس وقت بھی بڑی شخصیات سے مرعوبیت ہوتی تھی۔ اور انھیں دیکھنے کا شوق ہوتا تھا۔ کالج میں ساحر لدھیانوی ہمارا سینئر تھا۔ اس وقت شاعروں میں ساحر، آغا خاموش، ظہیر کاشمیری اور اعجاز اکرم وغیرہ بھی ہوتے تھے۔ وہ ''رومان'' کا زمانہ تھا۔ نثر میں ادیب کی ''صحرانورد کے خطوط'' نے بہت متاثر کیا۔ یوسف کی شاعری بہت اچھی لگی لیکن ان کی شخصیت نے بالکل متاثر نہ کیا''

(میزان۔ اگست 1996ء)

بعض شعراء کے معاملے میں دور کے ڈھول سہانے والی بات ہوتی ہے۔ یوسف ظفر نے فکری اعتبار سے عرش صدیقی کو متاثر کیا۔ لیکن جب انھوں نے عرش صدیقی سے ملاقات پر ان سے سرد مہری پر مبنی رویہ اختیار کیا تو ان کی شخصیت عرش صدیقی کے لیے اتنی متاثر کن نہ رہی۔ اس کے پس منظر میں کیا واقعہ ہے۔ اس پر روشنی یوں پڑتی ہے، خود عرش صدیقی کہتے ہیں۔

''یہ 1948ء کے اواخر کی بات ہے جب ہم لاہور آئے۔ ہم نے جس گلی میں

رہائش اختیار کی اس میں یوسف ظفر بھی رہتے تھے۔ میں ان کی کتاب ''زندان''
پڑھ چکا تھا۔ ایک دن میں انھیں ملنے کے لیے ان کے مکان پر چلا گیا۔ وہ اپنی
بیٹھک میں لحاف اوڑھ کے لیٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے اندر بلایا لیکن ان
سے مل کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ اپنی شاعری کے برعکس بہت خشک مزاج نکلے۔
انھوں نے مجھے حلقہ ارباب ذوق میں آنے کی دعوت دی جب میں وہاں گیا تو چونکہ
یوسف ظفر سے میری ملاقات ہو چکی تھی اس لیے انہیں چاہیے تھا کہ میرا وہاں
تعارف کراتے لیکن انھوں نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس وقت وہاں قیوم
نظر، امجد الطاف اور اعجاز بٹالوی وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے مجھ پر کوئی
اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ وہیں پر حسن عسکری، عارف عبدالمتین اور ناز ش کاشمیری سے
ملاقات ہوئی۔ حلقے کے بانیوں میں سے ایک شخص شیر محمد اختر میرے گہرے دوست
بن گئے اور یہ دوستی ان کی موت تک جاری رہی''۔

(**میزان۔ اگست۔ 1996ء**)

عرش صدیقی ایک طویل عرصہ لاہور میں مقیم رہے۔ اس دوران ان کا متعدد ادیبوں سے
دوستی کا گہرا رشتہ بنا۔ ان کی شخصیت میں خودنمائی نہیں تھی۔ بلکہ ایک طرح کی نرمی تھی۔ اردو
ادب میں اپنی پہچان کے سفر آغاز میں حلقہ شعرا سے متعارف ہونے کے لیے جب وہ حلقہ
ارباب ذوق کے ماہانہ جلسے میں گئے تو عارف عبدالمتین کے بقول ناز ش کاشمیری نے انھیں اس
وقت دوستوں سے ملوایا جب وہ لاہور میں چھوٹی چھوٹی ملازمتوں اور دو روپے سے دس روپے
ماہانہ ٹیوشنوں کے ذریعے مہاجرت کے اقتصادی زخموں کو مندمل کرنے کی عاجزانہ مگر دیانت
دارانہ کوشش کر رہے تھے۔

''ناز ش کاشمیری کی دوستی انھیں ہم تک لائی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر وہ یوں اپنے
محدود حلقہء احباب سے باہر نہ نکلتے تو ان کی شخصیت اس بلندی تک پہنچتی یا نہ پہنچتی

جہاں وہ اس وقت متمکن ہیں۔ یاد ہے کہ جب نازش کاشمیری نے ان کا تعارف
کرواتے ہوئے کہا کہ ان سے ملیے، یہ ہیں عرش صدیقی! تو میں نے محسوس کیا گویا
مجھے Love at first Sight کا تجربہ ہو رہا ہے۔ میری روح نے عرش
صدیقی کی باوقار شخصیت کی بظاہر خوبیوں اور باطنی حسن کا آناً فاناً ادراک کیا اور پہلا
خیال جو میرے ذہن میں کوندے کی طرح لہرایا وہ یہ تھا کہ عرش صدیقی میں واقعی
عرش کی سی رعنائیاں ہیں۔"

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص 11)

عرش صدیقی نے اپنی عمر کا سنہری دور شہر اقبال لاہور میں گزارا۔ یہاں کی دوستیاں اور تعلقات
ساری عمر ان کا اثاثہ رہے۔ ملازمتی امور کے سلسلے میں وہ ملتان چلے آئے۔ ان کی بقیہ تمام عمر اسی
شہر میں گزاری۔ عارف عبدالمتین نے لکھا تھا:

"عرش صدیقی نے ملتان کو اپنی مستقل سکونت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ اب وہ
لاہور کی طرف بہت کم رخ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک مکان بنا لیا ہے۔
جس کا نام انھوں نے "المنزہ" رکھا ہے اور ایسا کرتے ہوئے شعوری یا لاشعوری
طور پر وہ خود اس لازوال محبت کی پناہ میں چلے گئے ہیں جو منزہ کی صورت میں کبھی
ان کی پناہ میں تھی"

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص 17)

عرش صاحب کا گھر "المنزہ" ان کی مرحوم بیٹی کے نام پر رکھا گیا۔ عرش صدیقی ساری عمر اپنی
مرحومہ بیٹی کی وفات کا دکھ اپنے دل میں لیے پھرے۔ یہ الگ بات کہ دنیا کے کام بھی خوش اسلوبی
سے انجام دیتے رہے۔ جاوید اختر بھٹی اپنے ایک مضمون "عرش صاحب کی باتیں اور یادیں"
میں لکھتے ہیں:

"میری ایک بڑی بہن خون کے سرطان میں مبتلا تھی۔ وہ سکول میں بیگم عرش صدیقی
کی شاگرد تھی اور وہ اکثر عرش صاحب کی مرحومہ بیٹی منزہ کا ذکر کیا کرتی تھی۔ ایک

دن اس نے مجھے منزہ کی دو تصویریں دیں۔ یہ تصویریں اس نے خود کیمرے سے بنائی تھیں۔ اس نے کہا یہ تصویریں بیگم عرش صدیقی کو دے آؤ"۔ میں تصویریں لے کر عرش صاحب کے گھر گیا اور وہ انہیں لے کر اندر چلے گئے اور آوازیں دینے لگے ۔غوثیہ! یہ دیکھو، بھٹی منزہ کی تصویریں لے کر آیا ہے۔ اس کی بہن تمھاری شاگرد ہے ۔کیا تمہیں یاد ہے؟۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد کمرے میں واپس آئے اور کہا۔ میری بیگم کو یاد ہے اور اس نے آپ کی بہن کا نام ممتاز بتایا ہے۔ کیا درست ہے؟ میں نے کہا ۔"جی درست ہے"۔

(عرش صاحب کی باتیں اور یادیں. ص242)

اسی طرح سید فخر الدین بلے کے صاحبزادے اور جواں مرگ شاعر آنس معین کے بھائی ظفر معین بھی اپنی یاداشتوں کو یوں کھنگالتے ہیں:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آنس معین کی اچانک وفات کے بعد ہم لوگ کس قیامت سے گزرے تھے۔ انھی دنوں عرش صاحب نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا کہ آپ میں سے کسی کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ آپ مجھے دیکھیں بظاہر میں کس قدر مطمئن نظر آتا ہوں مگر میرے سینے پر کتنا بڑا گھاؤ ہے۔ میں آپ کو دکھا نہیں سکتا۔ منزہ بیٹی کی اچانک موت کے بعد ہم پر کیا گزری کسی کو نہیں معلوم۔ ہاں واقعی جوان موت اور جوان اولاد کی موت والدین کو جیتے جی مار ڈالتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بلے صاحب سے یہ تک نہیں کہا کہ صبر کیجیے کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ یہ کہنا میرے بس کی بات نہیں اور ایک میں کیا ہر دوسرے شخص کو ٹٹول کر دیکھیں وہ اپنے اندر دکھوں اور غموں کے طوفان کو چھپائے پھر رہا ہوگا"

(دنیائے ادب کا عرش. ص 39)

عرش صدیقی کی اکثر نظمیں بیٹی "منزہ" کے موت کا نوحہ لگتی ہیں۔ لیکن ایک نظم تو اسی کے نام موسوم ہے۔ دیکھیں اس نظم میں کتنا گہرا غم واندوہ محسوس ہوتا ہے:

میری ننھی بچی، منزہ کہ جس کو

ابھی اس کی امی بہت پیار کرتے سوگئی ہے

مجھے میرے ماضی کی قندیل لے کر

کسی آنے والے زمانے کی تصویر دکھلا رہی ہے

کہ ہو کر جواں جب

وہ امی کے حسنِ سکوں بخش کی یاد تازہ کرے گی

تو اک اجنبی جانے کس شہر کے کون سے راستے سے

سجائے ہوئے اپنے ماتھے پہ تاروں کا سہرا

لیے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا گجرا

مرے پاس آئے گا اپنے مقدر کا زور آزمانے

میں اس کی خوشی کے لیے زندگی کے اثاثے کو قربان کروں گا

وہ ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا میری تسکینِ جاں کو

مرے لختِ جگر کو، مرے مرکزِ آرزو کو

نہ جانے کہاں، کون سے دیس کی کون سی وادیوں میں مقید کرے گا

میں اس آنے والے زمانے کی تصویر ہر شب

دریچوں میں، کمروں میں یا صحنوں میں بجتی ہوئی دیکھتا ہوں

اور اپنے خدا سے

(مرا ہو کے مجھ سے جدا رہنے والے خدا سے)

فقط اک دعا۔۔۔ ایک اتنی دعا مانگتا ہوں

کہ اس اجنبی کا بھی میرا سا دل ہو

عرش صدیقی کی محبت صرف ان کی اپنی اولاد تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ نئی نسل کی ایک خاص انداز میں تربیت چاہتے تھے ان کی گفتگو کا موضوع نوجوان ہوا کرتے تھے۔ کسی ادبی انجمن کے

اجلاس میں ایک نوجوان کو سیکرٹری منتخب کیا گیا تو کوئی ادیب بھی اس کا نائب سیکرٹری بننے کے لیے تیار نہ تھا کہ تمام شرکاء اس نوجوان سے سینئر تھے۔ عرش صاحب نے خود کو اس منصب کے لیے پیش کیا اور ہر لحاظ سے اس نوجوان کی معاونت کرتے رہے۔ اگر کوئی نیا شاعر، ادیب ان کے دولت کدے پر حاضر ہوتا تو اسے پورا پروٹوکول ملتا۔

اپنے تنقیدی مضامین کی کتاب ''محاکمات'' کا نام انھوں نے ایک نوجوان شعیب ابراہیم کے مشورے پر رکھا۔ بقول جاوید اختر بھٹی:

''عرش صاحب واپسی پر ہمیشہ دروازے تک چھوڑنے آتے تھے اور اس وقت تک گھر کی طرف واپس نہیں جاتے تھے۔ جب تک مہمان گلی سے اوجھل نہ ہو جاتا تھا''

(عرش صاحب کی باتیں اور یادیں۔ ص 242)

مبین مرزا، عرش صدیقی کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں عرش صاحب کا باقاعدہ سٹوڈنٹ تو کبھی نہیں رہا لیکن، ان سے کسبِ فیض کے مواقع مجھے ایک شاگرد ہی کی طرح حاصل رہے۔ بلکہ شاید اس سے بھی کچھ سوا۔ وہ اکثر پوچھا کرتے تھے، کیا پڑھ رہے ہو یا اس کتاب سے کیا ملا؟ وہ کتاب اب تک کیوں نہیں پڑھی، فوراً پڑھ ڈالو۔ ریڈیو پر میرے پروگرامز، فیچر رائٹنگ، مشاعروں میں شرکت اور تقریباتی مصروفیات سے وہ خوش تو ضرور ہوتے تھے لیکن گاہے بگاہے اس تشویش کا اظہار بھی کرتے رہتے کہ یہ سب **Activities** کہیں **Educational Life** اور **Career Planning** کی **Cost** پر تو نہیں ہو رہی ہیں''

(اک چراغ اور بجھا۔ ص 171)

اس طرح کا ایک واقعہ افتخار شفیع کی یادداشت کا بھی حصہ ہے۔ جب ان کے احباب مختار علی، شناور اسحاق اور شاہد ملک وغیرہ نے اردو اکیڈمی ملتان کے ہفتہ وار اجلاس میں ان کی نظم تنقید کے لیے رکھوائی اور وہ جب نظم پیش کر کے واپس آئے تو لوگوں نے جو آراء دیں ان میں سے عرش

صاحب کی رائے سب سے مختلف تھی اپنے ایک مضمون مشمولہ ''ماہ نو'' لاہور میں وہ لکھتے ہیں:

''کسی نے نظم پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس پر امجد اسلام امجد کے گہرے اثرات ہیں۔ اصغر ندیم سید اور انور جمال نے اس بات کی شدید مخالفت کی اور اس نظم کو کہیں بلند فکر قرار دیا۔ ایک بزرگ، سفید بالوں کی چاندی کے ساتھ براجمان تھے۔ چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ گلے میں کالر لگا تھا۔ مسلسل خاموش بیٹھے رہے۔ اجلاس کے اختتام پر انھوں نے میرا بازو پکڑا اور ایک طرف علیحدہ لے جا کر اپنی بیماری کا عذر پیش کیا اور کہا کہ لکھنا جاری رکھو۔ میں زیادہ گفتگو نہیں کر سکتا لیکن تمھیں تھپکی ضرور دے سکتا ہوں۔ یہ بزرگ عرش صدیقی تھے''۔

(دسمبر کیا گیا ؟ ص 72)

عرش صدیقی نوجوان نسل کی حوصلہ افزائی تو کرتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی ''بت شکنی'' کرنا بھی ان کا معمول تھا۔ وہ اکثر شہرت کے بڑے بڑے ابوالہولوں کو اصل حقیقت سے آشنا کرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اسی قسم کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے:

''ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے لیے ان کی نواسی کی شادی اہم تھی لیکن عرش صدیقی سے ملاقات اہم ترین۔ واپس آئے تو انھوں نے بتایا کہ عرش صاحب سے بڑی سرگرم بحثیں ہوئیں۔ ہم نے ادب کا کوئی موضوع نہیں چھوڑا جس پر تفصیلی بات چیت نہ کی ہو۔ مجھے اس بات سے بڑی طمانیت ہوئی کہ وہ صحت مند ہو رہے ہیں اور اردو اکادمی ملتان کے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کشادہ دلی سے کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ لطیفہ بھی سنایا کہ ایک مرتبہ اس کمرے میں سلیم اختر آ کر ٹھہرے تھے۔ صبح اٹھے تو عرش صاحب کو بتایا کہ انھیں رات بھر نیند نہیں آئی؟ عرش صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ کو نیند کیسے آتی۔ چند روز قبل اسی کمرے میں ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید قیام کر کے گئے ہیں''

(محبت لفظ تھا اس کا، 168)

ڈاکٹر عرش صدیقی ایک خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ اس پر خوش لباس اور خوش گفتار بھی تھے۔ ان کی شخصیت کی یہ ساری خوبصورتیاں مل کر ایک خاص وضع کی صباحت اور دلکشی کو جنم دیتی تھیں۔ وہ درویشوں جیسی صفات رکھتے تھے۔ بقول لطیف کاشمیری:

''عرش کی طبیعت میں تیز دھوپ ایسی درشتی یا شدت نہیں ہے بلکہ کسی خاموش جھیل کی سطح ایسا ٹھہراؤ اور ٹھنڈک ہے۔ سکون اور دھیما پن ہے۔ توازن اور بردباری ہے۔ اسے غصہ پر قابو پانا آتا ہے۔ گو عام طور سے اسے غصہ نہیں آتا لیکن انسانی جبلت کے تحت کبھی آ بھی جائے تو فرد کی بجائے ان حالات پر جو جرم و خطا کے ارتکاب کا سبب بنتے ہیں۔ یوں اس کا ماتحت عملہ ہو یا کوئی نیا، پرانا شاگرد، اس کی نرم خوئی اور حسن سلوک سے کبھی محروم نہیں رہتا۔۔۔ وہ کسی خاص فرد کا مربی نہیں بلکہ سب کا بہی خواہ ہے۔ ایک محبت کرنے والا اور دوسروں کی بھلائی کے لیے فکر مند رہنے والا، ایک درویش صفت انسان۔ جس کی نظر میں پیری مریدی کا دھندا اگر جائز اور مستحسن ہوتا تو آج ضلع کانگڑہ کے علاوہ ملتان، لاہور اور مری میں اس کے ہزاروں مریدانِ باصفا ہوتے''۔

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص23)

عرش صدیقی خوش لباس تو تھے ہی، شروع میں کالج آنے جانے کے لیے وہ سائیکل کو بطور سواری استعمال کرتے تھے پھر بتدریج سائیکل کی جگہ سکوٹر اور کار نے لے لی۔ خالد پرویز نے عرش صدیقی پر لکھے گئے اپنے ایک مضمون میں بڑے خوبصورت پیرائے میں اس کا تذکرہ کیا ہے:

''گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان میں ہمیں اس دور میں بدیسی زبان کے اسرار و رموز بتایا کرتے تھے جب آپ سر پر فلیٹ ہیٹ، ہاتھ میں زلفی رنگ کا بیگ، بغل میں عسکری سٹک اور ٹائی فینٹاسٹک پہنتے تھے۔۔۔ البتہ سواری کے لیے مرزا کی بائیسکل کے قبیلے کی موٹر سائیکل استعمال کرتے تھے۔ ایک روز طویل بحر کی

غزل کے مانند لبریٹا پر تشریف لائے۔ فرمانے لگے کہ وہ حسین آگاہی کی چڑھائی چڑھا ہی چاہتے تھے کہ کسی آواز لگانے والے نے چپکے سے آواز لگائی، ''عرش صاحب! آپ کو یہ موٹر سائیکل نہیں جچتی، اور آپ نے اگلے ہی روز بدل لی''۔

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص32)

عرش صدیقی کا دوستوں کے ساتھ نہایت عمدہ رویہ تھا۔ طبعاً وضعدار ہونے کی وجہ سے ان کے گرد لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ملتان میں ان کے قریبی دوستوں میں ارشد ملتانی، ڈاکٹر اے بی اشرف، فرخ درانی، مرزا ابن حنیف، ڈاکٹر فاروق عثمان، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر محمد امین، ڈاکٹر طاہر تونسوی، مبارک مجوکہ، ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی، اور جاوید اختر بھٹی شامل تھے۔ وہ اپنے دوستوں کو کیا عام لوگوں کے ذہنوں پر بھی روحانی طور پر مسلط ہو جاتے تھے۔ چند واقعات میں دیکھیے عرش صاحب مرحوم کتنے خوبصورت اور قلب و نظر میں سما جانے والے شخص کے طور پر ابھرتے ہیں:

''جب ان کی کوئی کتاب شائع ہوتی تو وہ اسے دوستوں میں تقسیم کرنے کے لیے بے چین ہو جاتے، جب اعزازی نسخے ختم ہو جاتے تو پبلشر سے مزید کتابیں خرید لیتے۔ اور جب ایڈیشن ختم ہو جاتا تو اس کتاب کی پانچ دس فوٹو کاپیاں بنوا لیتے۔ بہر حال یہ سلسلہ جاری رہتا''

(عرش صاحب کی باتیں اور یادیں۔ ص 243)

''ملتان میں کوئی ادبی تقریب ہو کوئی کراچی سے ہوائی جہاز میں آئے یا پشاور سے ٹرین میں یا لاہور سے پیدل ملتان پہنچے۔ عرش صدیقی کے ڈیرے پر پہنچے گا۔ تعارف ہو نہ ہو دوستی ہو نہ ہو بس یہی کافی ہے کہ مہمان عزیز ادب کا رسیا ہے۔ بن بلائے مہمان کو اگر تھوڑی بہت شرم آتی بھی تو عرش صدیقی سے مل کر ختم ہو جاتی ہے''۔

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص3)

''عرش صدیقی بھرے پرے گھر اور احباب کے ہجوم سے بہت خوش ہوتے تھے۔ نو مبر 1995ء میں مَیں ملتان سے انقرہ کے لیے روانہ ہوا تو مجھے کہا، کچھ عرصہ پہلے زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے کسی کی آنکھوں میں اپنے لیے سچا پیار دیکھا ہے۔ میں نے رقابت کے جذبے سے مغلوب ہوکر پوچھا۔ عرش صاحب! وہ کون ہے؟ کہنے لگے میرے بیٹے جہاں زیب کا بچہ، جب میری گود سے نکلا تو ایسی محبت سے مجھے دیکھا کہ مجھ پر اس جذبے کی اتھاہ منکشف ہوئی''

(یاد گار زمانہ ہیں جو لوگ۔ ص28)

''ایک واقعہ یہ بھی ہوا کہ عرش صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے۔ ہوایوں کہ عرش صاحب نے ایک کتاب کا دیباچہ لکھا۔ میں نے ایک کالم لکھ دیا کہ عرش صاحب نے چھوٹی کتاب کا بڑا دیباچہ لکھا ہے۔ حسب عادت اس موضوع پر بڑی احتیاط سے گفتگو بھی کی اور پھر کوشش کی کہ ان کے سامنے نہ آؤں لیکن کتنے دن ...... ایک دن بیکن ہاؤس (ملتان) پر مل گئے۔ ملتے ہی ناراضگی کا اظہار کیا۔ تھوڑے سے غصے میں تھے۔ دوسری ملاقات پر وہ مجھ سے ناراض نہیں تھے۔''

(عرش صاحب کی باتیں اور یادیں۔ ص244)

مبین مرزا کے مطابق

''جب انھوں نے عرش صدیقی سے ملنا جلنا شروع کیا تو عرش صدیقی، اے بی اشرف، انوار احمد اور اسلم انصاری کی چشمک ایک مستقل رویے کی صورت اختیار کر چکی تھی۔''

(اک چراغ اور بجھا ص۔ 173)

ایک شہر کی دو بڑی شخصیات (عرش صدیقی اور اسلم انصاری) کا باہمی اختلاف سمجھ میں نہیں آتا، بظاہر اس ''چشمک'' کے پس منظر میں کسی قسم کی علمی نظریات کی موجودگی بھی محسوس نہیں ہوتی۔ عرش صدیقی اور اسلم انصاری کے باہمی اختلافات کا موضوع بعض ''یونین کونسل'' کی سطح

کے ادیبوں کے لیے بڑا موضوع بحث رہا ہے۔ بعض ''پردہ نشینوں'' نے اس سے خوب فائدہ بھی اٹھایا۔ مبین مرزا کی اس موضوع پر عرش صاحب سے ایک دفعہ بات چیت ہوئی۔ انھوں نے اس کا جواب بڑی تفصیل سے دیا۔ مستقبل کے اردو ادب کے طالب علموں کے لیے اجمال اس تفصیل کا یوں ہے:

''وہ (عرش صاحب) اکثر واشگاف لفظوں میں کہا کرتے تھے۔ اسلم انصاری کالج میں میرے بچوں کے استاد رہے ہیں۔ میں ان کی علمی قابلیت، مطالعے اور معلمانہ صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ وہ خوب صورت شاعر ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں۔ میرے ان سے اختلاف ان باتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی اور بنا پر ہیں۔۔۔ عرش صاحب جو واقعہ انصاری صاحب کی پی ایچ ڈی اور یونیورسٹی میں ان کی Appointment کے حوالے سے سنایا کرتے تھے اس میں بین السطور اس امر کا اظہار ہوتا تھا کہ لوگ اس سلسلے میں کیا کردار ادا کرتے رہے ہیں''

(اک چراغ اور بجھا۔ ص 175)

اس طرح کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں زمانہ بعض معاملات میں شریک کار تھا اور اسی کی وجہ سے دونوں طرف خفگی کی کیفیت رہی۔

اس طرح کے چند استثنائی واقعات سے ہٹ کر ملتان میں عرش صاحب کا گھر علمیت کا مرکز، اور دوستوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنا رہا۔ ان کی شخصیت میں جو خوبیاں تھیں ان کا اندازہ وہ لوگ با آسانی لگا سکتے ہیں۔ جو ان سے ملتے جلتے رہے ہیں۔ مبین مرزا کے بقول:

''جن لوگوں کو عرش صاحب یا ان ایسے لوگوں کی صحبتیں میسر نہیں رہیں وہ کیوں کر جان سکتے ہیں کہ والہانہ پن انسان کو فطرت کی کس قدر گراں مایہ ودیعت ہے۔ اور انسانی تہذیب کی کیسی اعلیٰ وارفع قدر۔۔۔ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے وہ بڑے لگاؤ اور چاؤ سے مختلف ڈشز خود ہاتھ بڑھا بڑھا کر پیش کرتے اور کھانے پر باتکرار

اصرار کرتے۔ ایک شام میں اوپر ان کی سٹڈی میں بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا، پہلے ٹھنڈے اور پھر چائے کا دور چل چکا تھا۔ نشست خاصی طویل ہو گئی تھی۔ گفتگو کے دوران عرش صاحب اٹھ کر نیچے گئے اور ذرا سی دیر میں آموں سے بھری ٹرے اٹھائے ہوئے چلے آئے۔ گفتگو پھر شروع ہو گئی۔ وہ ایک آم کاٹ کر رکھتے، پہلے وہ کھایا جاتا اور پھر وہ دوسرا کاٹتے، تعداد تو مجھے نہیں معلوم لیکن میرا خیال ہے کہ ہم نے خاصی معقول تعداد میں آم کھا لیے تھے۔ تب میں نے طبیعت کی سیری کا اظہار کیا۔ کہنے لگے، بھئی! یہ کیا بات ہوئی۔ میں آم کاٹتے کاٹتے تو تھکا نہیں۔ آپ کھاتے ہوئے کیوں تھک گئے۔ اور پھر کاٹنے لگے"۔

(اک چراغ اور بجھا۔ ص 176)

عرش صدیقی نے ملتان کو ادبی حوالے سے ایک دبستان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ ملتان کی قدیم ترین درس گاہ ایمرسن کالج میں استاد رہے۔ اس کے بعد ملتان یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے صدر بنے اور بعد ازاں انھیں رجسٹرار بنا دیا گیا۔ اپنے اختیارات سے انھوں نے کبھی بھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ملتان اور اس کے مضافات میں اردو ادب کے فروغ کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے ملتان کے شعرا و ادباء کو ملکی سطح پر متعارف کروانے کی بھرپور کوشش کی۔ ایک دن اپنی بیٹی سے کہنے لگے "تم قرۃ العین حیدر بن کر دکھاؤ۔ اس کا باپ علی گڑھ یونیورسٹی میں رجسٹرار تھا۔ تمہارا باپ ملتان یونیورسٹی میں رجسٹرار ہے"۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی عرش صدیقی مرحوم کی ملتان میں ادب کے فروغ کے لیے دی جانے والی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"عرش صدیقی ملتان کا شجر سایہ دار ہے۔ کیوں کہ اس نے نئی نسل کے شعراء کی جس طرح تربیت کی ہے اس سے ہم فکر شعراء اور ادباء کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا ہے جو ایک ہی نظریئے کا حامی ہے اور وہ ہے ادب میں انسانی اقدار کی نمائندگی اور استحصالی رویوں کے خلاف احتجاج۔ اس حوالے سے ان شاعروں کی تخلیقات دیکھ کر

اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی دبستانِ ملتان اپنا ایک وجود رکھتا ہے"۔

(ملتان میں اردو شاعری۔ ص26)

1970ء میں ملتان کے رائٹرز گلڈ شاخ کا آغاز ہوا۔ یہ ایک حوصلہ افزاء قدم تھا۔ ابتداً منشی عبدالرحمٰن، رفیق خاور جسکانی اور شیخ اکرام الحق اس کے معتمد رہے۔ عرش صدیقی نے **1972** سے لے کر **1976**ء تک اس ذمہ داری کو سنبھالا۔ اور چار سالہ سیکرٹری شپ کے عہد میں باقاعدہ تنقیدی اجلاسوں کے ذریعے ملتان میں اردو ادب کو کراچی اور لاہور کے برابر لا کھڑا کیا۔ بقول اقبال ساغر صدیقی:

"عرش صاحب کی ذات ملتان کا حوالہ اور شناخت تھی۔ میں دنیا بھر میں جہاں بھی گیا اور وہاں کے ادبی حلقوں کو جب پتہ چلا کہ ملتان سے آیا ہوں تو انہوں نے عرش صاحب کو پوچھا اور ان کی خیریت دریافت کی۔ ان کا فن، ان کی خوش اخلاقی، ان کی زندہ دلی، وضع داری اور خلوص ہمیشہ ہم سب کو یاد رہے گا۔ وہ شاعر، افسانہ نگار ہونے کے علاوہ محقق، نقاد، رائٹرز گلڈ کے منتخب سیکرٹری، اردو اکادمی کے مؤسس، مشہور ماہر تعلیم اور شفیق استاد تھے۔ ملتان سے شائع ہونے والی نوے فیصد کتابوں پر انہوں نے مقدمے لکھے۔"

(سب اچھا کہیں جسے۔ ادبی میگزین)

عرش صدیقی نے لکھنے کی ابتدا کب کی۔ یہ سوال تو اب تک ہمارے سامنے آیا ہی نہ تھا۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے اسے بچپن کا شاخسانہ ہی قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں:

"میں نے بچوں کی کہانیاں لکھ کر ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ پنجاب کا ایک علاقہ دھرم سالہ کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں ایک ریڈنگ روم تھا۔ ہم چند دوست مل کر آٹھ دس صفحے کا ایک قلمی رسالہ تیار کرتے تھے۔ جس میں ہماری کہانیاں شامل ہوتی تھیں۔ ہم وہ رسالہ ریڈنگ روم کے انچارج کے پاس جمع کروا دیتے تھے تاکہ دوسرے لوگ بھی ہماری کہانیاں پڑھ سکیں۔ جب ہمیں پتہ چلتا کہ لوگ ہماری

کہانیاں پڑھتے ہیں تو ہم خوش ہوا کرتے تھے۔"

(روزنامہ پاکستان ۔ ادبی میگزین)

ڈاکٹر عرش صدیقی نے اپنی تمام عمر چند اصول وضوابط کے تحت گزاری۔ آخری عمر میں جب انہیں گلے کے سرطان نے دبوچ لیا تو اس کے باوجود ان کی شخصیت کے اوصاف قائم رہے۔ بقول انور سدید:

"میں نے عرش صدیقی کو دور سے دیکھا تو وہ کچھ ڈگمگاتے سے نظر آئے۔ میرا خیال تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد جو پژمردگی اور یاسیت پر بڑے سرکاری افسر پر طاری ہو جاتی ہے، شاید عرش صاحب بھی اس کا شکار ہو گئے تھے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ عرش صاحب کے خلوص کا اعتراف وہ لوگ بھی کرتے تھے جو اپنی کتابوں پر ان سے دیباچہ نہیں لکھوا سکتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کے حسد کا رخ ایسے نوعمر ادیبوں کی طرف ہو جاتا جو عرش صدیقی سے "پیش لفظ" لکھوالاتے تھے اور منگنی کی انگوٹھی کی طرح بڑے بڑے ادیبوں کو دکھاتے تھے۔"

(محبت لفظ تھا اس کا ۔ ص166)

عرش صدیقی نے بڑی دلیری کے ساتھ سرطان جیسے موذی اور لاعلاج مرض کا مقابلہ کیا۔ لیکن آخر میں ان کی قوت مدافعت کمزور پڑ گئی۔ رجائیت کا رویہ ویسے بھی ان کی طبع کا خاص جزو تھا۔ وہ ہر وقت تازہ دم، توانا اور چوکس دکھائی دینا چاہتے تھے۔ یاسیت کا ان کی شخصیت پر کم ہی غلبہ ہوتا۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود عمر کا آخری حصہ انہوں نے خاصے کرب میں گزارا۔ ان کے بچے ملک سے باہر رہتے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بیماری انہیں آہستہ آہستہ گھن کی چاٹ رہی تھی۔ انہوں نے اپنے بستر کے سامنے کی دیوار پر تمام بچوں کی تصاویر آویزاں کر رکھی تھیں۔ جب ان کی کمی محسوس کرتے تو ان تصاویر کو دیکھ کر اپنی تشنگی بجھا لیتے۔ ہمین مرزا نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ:

"مرض کے تفصیلی علاج کے لئے جب وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے دانیال کے

ساتھ کراچی آئے تو مجھے اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ طارق روڈ پر ایک عزیز کے ہاں ان کا قیام تھا۔ میں اور راغب شکیب اکٹھے ملنے کے لئے پہنچے۔ ہمارے آنے کا سن کر دو منزلہ سیڑھیاں اتر کے خود لینے آئے۔ انہیں دیکھ کر دل بیٹھنے لگا۔ بیماری نے آدھا کر دیا تھا۔ سرخ و سفید رنگت سیاہی مائل پیلاہٹ سے جھلسی معلوم ہوتی تھی۔ نقاہت ایسی کہ دو سیڑھیاں چڑھتے تو سانس لینے سے رکنے لگتا۔ آنکھوں میں وہ ویرانی کہ دیکھنے والوں کو دنیا تاریک ہوتی ہوئی نظر آئے۔ لیکن مزاج کی کیفیت زندگی سے ایسی لبریز کہ بیماری کو منہ چڑاتی ہوئی معلوم ہوتی۔ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مجھے بھی ہمت نہ ہوئی کہ ان کے آرام ہی کی خاطر سہی رخصت کی اجازت طلب کروں۔ پھر جمیل الدین عالی صاحب آ گئے۔ میں نے کہا مجھے اجازت، کہنے لگے عالی صاحب کے ساتھ کھانے پر چلنا ہے۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ آپ لوگ بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ ہم لوگ اٹھ کر عالی صاحب کے ساتھ جم خانے چلے گئے۔ کھانے سے پہلے عرش صاحب انسولین کا انجکشن لگایا کرتے تھے۔ انہوں نے عالی صاحب سے پوچھا۔ عالی صاحب! یہیں انجکشن لگا لوں یا واش روم میں جانا پڑے گا۔ بے چارگی کا ناقابل برداشت کرب ان کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ نہیں۔ یہیں لگا لیں عرش بھائی۔ ذرا قمیض ہی تو اٹھانی پڑے گی آپ کو۔ عالی صاحب نے جواب دیا۔"

(اک چراغ اور بجھا۔ ص178)

عرش صدیقی کی شخصیت میں شگفتگی آخری وقت تک برقرار رہی۔ کہتے تھے:

"خدا کا لاکھ شکر ہے جس نے مجھے بیماری بھی دی تو عمر کے اکہترہویں سال میں۔ اس سے پہلے ہمیشہ تندرست اور توانا رکھا۔"

(دسمبر کیا گیا۔ ص72)

"کیئر کا تعلق اصل میں قبضہ گروپ سے ہے۔ ایک بار اندر اتر جائے تو پھر باہر نکلنے

کا نام نہیں لیتا۔ قبضہ جمائے رکھتا ہے۔ جاتا نہیں۔"

(ایک چراغ اور بجھا۔ ص179)

"میرے گھر والوں نے بکرا خیرات کیا۔ جب اس کے باوجود بھی میری صحت ٹھیک نہ ہوئی تو میں نے کہا۔ اللہ میاں! "یا مجھے ٹھیک کردو یا میرا بکرا واپس کردو۔"

(دسمبر کیا گیا۔ ص72)

عرش صدیقی کی بیماری کا سن کر بعض لوگوں نے ان کی مدد کے لئے انہیں چیک بھیجے۔ لیکن انہوں نے یہ چیک شکریہ کے ساتھ واپس بھیج دیئے اور کہا کہ میرا علاج اگر حکومت کروائے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں دوستوں کو اس کے لئے تکلیف نہیں دے سکتا۔ کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہونے والے عرش صدیقی بالآخر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی نماز جنازہ نشتر ہسپتال کے ہاسٹل کے گراؤنڈ میں ادا کی گئی۔ اور انہیں ہسپتال سے متصل قبرستان میں دفن کردیا گیا۔

جیتے ہیں تو سب کھل گئے اوصاف جہاں پر
مر جاتے تو اچھا تھا کہ رسوا تو نہ ہوتے

ڈاکٹر غلام جیلانی اصغر نے عرش صدیقی کی وفات کا نوحہ کچھ اس طرح لکھا تھا:

وہ جو اک شخص تھا وہاں نہ رہا
یعنی وہ شہر خوش گماں نہ رہا

وقت تھا جو ہمارا زنداں تھا
اب وہ دونوں کے درمیاں نہ رہا

کون لکھے ترا جریدۂ شوق
دل وہ پہلے سا قصہ خواں نہ رہا

اب تو کار زمیں ہی کافی ہے
خیر سے خوف آسماں نہ رہا

تجھ سے مل کر بچھڑ کے دیکھ لیا
زندگی شوق رائیگاں نہ رہا

اب جو ہونا ہے آج ہو جائے
کوئی اندیشۂ زیاں نہ رہا

(اوراق)

ڈاکٹر عرش صدیقی کی نظم نگاری

ڈاکٹر عرش صدیقی کی آزاد نظم کے حوالے سے اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ نظم کے اہم شاعر ہیں۔ اہم ان معنوں میں جیسے ن۔م راشد، میرا جی اور مجید امجد ہیں۔ عرش صاحب کی تخلیقی جہتوں میں شاید نظم سب سے زیادہ قابل توجہ ہے۔ ان کی نظمیت سے بھرپور شاعری غنائیت اور فنی مہارت کی عمدہ مثال بھی ہے۔

تخلیق خود اپنی موجودگی کا جواز پیش کرتی ہے لیکن ہمارے ناقدین حضرات "انجمن ستائش باہمی" کے سنہری اصولوں کے تحت اس طرح غیر ضروری محاسن و معائب بیان کرتے ہیں کہ ساری تخلیقی سچائیاں چند لمحوں کے لئے مسخ ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ عرش صدیقی نے اپنی نظم میں ان آفاقی سچائیوں کو موضوع بنایا ہے جو روح عصر کی طرح زندہ رہتی ہیں۔

ان نظموں کے تخلیقی بالغ پن کی ایک وجہ شاید عرش صدیقی مرحوم کا اپنا بالغ تنقیدی مزاج ہے۔ انہوں نے اپنے ہر فن پارے کی بڑے سخت ناقدانہ نقطہ نظر سے جانچ پڑتال کی ہے۔ عرش صدیقی کی نظموں کی تفہیم کے لئے ان کی تنقیدی مزاج اور اس کے وضع کردہ اصولوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے "تکوین" کے پہلے مضمون میں اپنا موقف بڑے توانا انداز سے پیش کیا ہے۔ اس کے چند اہم حصے یہ ہیں:

1۔ میں اصولی طور پر توازن کو عزیز رکھتا ہوں۔

2۔ مجھے زندگی کے ہر شعبے میں عموماً اور ادب و فن میں خصوصاً شعور کی برتری پسند ہے۔

3۔ میرے نزدیک یہ تصور احمقانہ ہے کہ تخلیق اولاد کی طرح عزیز ہوتی ہے۔

4۔ ہر تخلیق کار کو اپنا نقاد خود ہونا چاہیے۔

5۔ میں تخلیق شعر کے اس نظریئے کو مسترد کرتا ہوں کہ شعر الہام ہے اور شعری مضامین غیب سے نازل ہوتے ہیں۔

6۔ شعر کہنا میری مجبوری ہو سکتا ہے لیکن ضرورت ہر گز نہیں۔

عرش صدیقی کی نظم کا جائزہ لینے کے لئے ان کے تصورات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اور انہی امور کی مدد سے ان کی تخلیقیت کا بھرپور محاکمہ کیا جا سکے گا۔ درحقیقت عرش صدیقی کا تعلق شعرا کی اس نسل سے ہے، جس نے زندگی کو کھلی آنکھ سے دیکھا ہے اور معروضی حقیقتوں کو تسلیم کرنے پر زور دیتی ہے۔ ان کی نظم میں ایک تاثر داستان گوئی کا بھی ابھرتا ہے، جس کے مرکزی کردار خود عرش صدیقی ہی ہیں۔ عرش صدیقی دبستانِ ملتان سے تعلق رکھنے والے ایسے شاعر ہیں، جس نے کئی نسلوں کی علمی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ عرش صدیقی کی نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

''عرش صدیقی کا ''دیدۂ یعقوب'' طبع ہوا تو اسے جدید شاعری کی ایک اہم کتاب گردانا گیا اور اب کوئی سولہ سترہ برس بعد دوسرا مجموعہ ''محبت لفظ تھا میرا'' چھپ کر آیا ہے۔ عرش صدیقی نے اپنے فنی مقاصد پر ایک مضبوط دیباچہ بھی قلم بند کیا ہے جو عرش کی شاعری کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ عرش کی نظمیں اس کی ذات کا رزم نامہ ہیں۔ اس ضمن میں ''میں بے ادب تھا''، ''رائیگاں آزادیوں کے بے ثمر انچاس سال''، ''مسافر آخر شب کا'' اور ''ساوی لا'' کا بطور خاص حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے میں عرش صدیقی کی مشہور نظم ''اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے'' بھی شامل ہے۔''

(پاکستان میں اردو ادب سال بہ سال۔ ص 94)

انہی نظموں سے متعلق اسی تنقیدی شعور کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی نے بڑی خوبصورت گفتگو

کی۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی سے ایک ملاقات میں انہوں نے کہا تھا۔

''عرش صدیقی نے ''محبت لفظ تھا میرا'' کے آغاز میں خود اپنے متعلق اور اپنی شاعری کے بارے میں اتنی سچائی اور دلیری سے گفتگو کی ہے کہ کسی اور کے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی''

(دنیائے ادب کا عرش ۔ ص147)

عرش صدیقی کی نظمیں زندگی کے حقیقی رنگوں کی عکاس ہیں۔ ان کے ہاں تصنع، بناوٹی اور فریبانہ موضوعات کا گزر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو ہر سطح پر نوازا گیا۔ یہ فطرت کی دین ہے کہ انہیں جو موضوعات ودیعت کیے گئے ہیں۔ ان کے آفاقی انداز نے ان کی شاعری کو اہم، معتبر اور محترم بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، عرش صدیقی مرحوم کی نظموں کے متنوع قسم کے موضوعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''عرش صدیقی کی نظمیں متنوع موضوعات لیے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں رومانیت کا جو رویہ نظر آتا ہے وہ فیض اور راشد سے مختلف ہے۔ ان کے ہاں تلاش، تجسس اور تحیر کی ایک عجیب فضا موجود ہے۔ نظم کا رومانی انداز اسلوب کے حوالے سے کہانی سے ملتا جلتا ہے مگر اس کا آخری مصرعہ اس جمالیاتی طلسم کو توڑ کر رکھ دیتا ہے اور قاری کو ایک جھٹکا لگتا ہے۔ رومانی رویے کے پس منظر میں ایک ہلکی سی یاسیت کا پرتو بھی محسوس ہوتا ہے جو تاثریت میں اور اضافہ کرتا ہے۔ نظموں میں کہیں کہیں داستانی اور اساطیری حوالے بھی ملتے ہیں۔

نظموں کا اسلوب نیا اور منفرد ہے۔ اس میں گھر آنگن کی شاعری بھی ہے اور بیوی بچے بھی نظر آتے ہیں۔ یوں تو عرش صدیقی کے ہاں بے شمار علامتیں موجود ہیں مگر سفر کا استعارہ زندگی کی ٹوٹ پھوٹ، المیے اور انسان کے اندر کا کرب عرش صدیقی کی نظموں کا بنیادی موضوع ٹھہرتا ہے۔ عرش صدیقی نے اگرچہ نئی تراکیب بھی

تراشی ہیں مگر پرانے لفظوں کو جنہیں نئی تفہیم کے ساتھ انہوں نے استعمال کیا ہے اس کی بنا پر نظموں کی معنویت اور تاثریت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔عرش صدیقی کے ہاں جنسی رویوں کا ہلکا سے پرتو بھی دکھائی دیتا ہے گندم کا استعارہ عرش صدیقی کی نظموں میں آیا ہے۔اس حوالے سے عرش صدیقی اردو نظم کے اہم شاعر ہیں اور ازدو شاعری ان کے بغیر نامکمل ہے۔''

(**ملتان میں اردو شاعری .ص**156.155)

یہاں عرش صدیقی کی ایک نظم ''میری روشنی لوٹا دے'' کا حوالہ دینا ضروری ہے۔نظم کا آغاز بڑی خوب صورت امیجری سے ہوتا ہے:

مسکراتی، دل نشیں دلدار، ٹھنڈی شام نے
ایک دن چپکے سے ساری روشنی کو
ایک گٹھڑی میں سمیٹا، بائیں شانے پر دھرا، تیزی سے بھاگی
اور اک دریا کنارے جا رکی!
کیا سیہ دریا تھا، جس کا تھا کنارا بھی سیہ اور تیز بہتا، شور کرتا پانی بھی سیہ!
تیز دریا اک سمندر کی طرح تھا جو موج زن اور کف بہ کف
ایسے لگتا تھا زمانہ شب کی تاریکی سے ہم آغوش تھا

نظم کے آغاز میں شام کا رات سے ہم آغوش ہونا ایک خوب صورت منظر کی صورت میں پیش ہوتا ہے۔اس مرحلے پر انکشاف ذات ہوتا ہے۔یہاں پر نظم ایک غیر منقسم داخلی وحدت کی حامل دکھائی دیتی ہے۔نظم کے ایک خاص قسم کی پراسراری میں غوطہ زن ہونے کا نظارہ فقط کسی ایسے ہی جذبے کا اظہار نہیں بلکہ اس سے ہٹ کر جذبات کی ابتدائی نمو و تشکیل سے لے کر اس کے انکشاف تک کے مراحل پر مبنی ہے۔عرش صدیقی کے نظم کی ابتدا میں ہی ایک کسی حد تک غیر واضح ہیولا سا بنایا ہے۔بنیادی طور پر اس نظم کے تین اہم جزو ہیں۔شام، رات اور عرش صدیقی۔نظم کی

بنیاد ہی انہی تین کرداروں کے اردگرد گھومتی ہے۔ یہاں شام ایک وسیع علامت کی طرح شاعر کے لیے زندگی اور حسن کا استعارہ بن گئی ہے۔ اور شاعر کے تخیل میں اس لمحے ایک التجائیہ لہجہ وارد ہوتا ہے۔

اے مری ہم درد، میری مسکراتی شام! میں شیدا تیرا
زندگی کے نام اندھاپن کوئی تحفہ نہیں!
روشنی سے تھامرا ہونا، تجھے معلوم ہے!
تیرے رنگوں، تیری چھاؤں، تیرے ٹھنڈے لمس پر قربان میں
اپنے شیدا کو اندھیرے میں بھٹکنے کو نہ چھوڑ!
رات اے کم خواب کالی رات! میں تیرا رفیق،
بارہا، برسوں تری تالیف میں جاگا ہوں تیرے ساتھ میں!
مانتا ہوں روشنی پر بے طرح بھاری ہے تو

شاعر رات کی کم خوابی میں رتجگوں کو اپنا مقدر سمجھ کر خاصا بے چین ہے۔ یہاں رات اسے اپنی دیرینہ رفیق محسوس ہوتی ہے۔

میں اندھیرے کے بدن میں جانکنی کے خوف میں ملفوف ہوں
مضطرب رکھتی ہے دہشت بے بسی، بے اختیاری کی مجھے

یہاں عرش صدیقی کے ہاں ژاں پال سارتر کی صدائے بازگشت سنائی رہتی ہے۔ وجودیت کی فکر کا حامل یہ عالمی شہرت یافتہ عالم اپنی سوانح حیات "WORDS" میں لکھتا ہے:

I had tried to take refuge from glory
and dishonour in the loneless of true self;
but i had no true self": I found nothing
with me except a surprised inspidity.

یہاں ضروری تھا کہ عرش صدیقی کی نظم "میری روشنی لوٹا دے" کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔

اس نظم میں شاعر انسانی جذبات کی اس حقیقت کو کھول کے رکھ دیتا ہے، جس کے تحت وہ مشاہداتی سطح پر موت سے ہم کنار ہوتا ہے۔ ایک خالص قسم کا مشرقی طرز احساس اس نظم کا خاصہ ہے۔ عرش صدیقی کی نظموں میں ایک خاص قسم کی لفاظی ہے، جو صرف انھی سے متعلق ہے۔ اگرچہ ان کی نظموں میں ن۔ م۔ راشد اور مجید امجد کے بالواسطہ اور بلاواسطہ اثرات بھی کارفرما ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کا اپنا علیحدہ تشخص بنتا ہے۔ ان کی نظموں کے اس خوب صورت پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

> "عرش صدیقی کی نظموں کی ڈکشن بہت خوب صورت ہے۔ اس کا ایک امتیازی وصف اس کی روانی ہے۔ ان نظموں کا موضوع تو ایک طویل سفر ہے ان میں صرف ہونے والی امیجز، تراکیب بلکہ الفاظ تک سفر کی سی روانی کا منظر دکھاتے ہیں۔ چونکہ نظم کا Flow داخلی غنائیت سے پھوٹتا ہے اس لیے مجھے یہ کہنے دیجیے کہ عرش صدیقی کی نظمیں اپنی غنائیت کے اعتبار سے حد درجہ قابل مطالعہ ہیں اور ان کے امیجز میں تازگی کا احساس ہوتا ہے"۔

(دائرے اور لکیریں ۔ ص 80)

یہاں اس کی مثال کے طور پر عرش صدیقی کی نظم "کامیاب سفر کا انعام" پیش کی جا سکتی ہے۔ اس نظم میں وہ اساطیری رنگ پیش کیا گیا ہے۔ جس کے مطابق کسی سے آسانی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھا نہیں جا سکتا ہے۔ شہزادے، شہزادیوں کو حاصل کرنے کے لیے انوکھی انوکھی مہمات سر کرنے نکل پڑتے تھے۔ کامیابی و کامرانی کے حصول کے بعد ان کا استقبال شایانِ شان طریقے سے کیا جاتا اور انعام کے طور پر شہزادی کا ہاتھ اسے تھما دیا جاتا۔ یہاں دیکھیے عرش مرحوم نے پرانی کہانیوں کو کیسے اپنے عہد کے ساتھ جوڑ دیا ہے:

تمھیں کیا خبر میں صعوبت کے کن کن مراحل سے،

کن کن سیہ گھاٹیوں سے گزر کر

یہاں آرہا ہوں۔۔۔

مگر ہفت خوانِ وفا میں نے طے کرلیا ہے

اب ان راستوں پر جہاں میرے نقشِ قدم جل رہے ہیں

کوئی اژدہا، کوئی سیمرغ، گہرا سمندر کوئی

کوئی طوفان باراں، کوئی شیر یا بھیڑیا

یا کوئی جادوگرنی نہیں ہے

تمھاری جو شرطِ وفا تھی وہ پوری ہوئی ہے

کہ میں ان بلاؤں سے آبادیوں سے بچ کر اگر لوٹ آؤں تو انعام دو گے

یہی رنگ ایک دوسری صورت میں اس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جب محبت کا جواب محبت کی بجائے بھیک کی شکل میں ملتا ہے۔ عاشق جو سرتاپا عشق کے مقدس جذبوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ جو شانِ گدایانہ کے ساتھ محبوب کی طرف بڑھتا ہے تو اسے عجیب و غریب سی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

میں اک شانِ گدایانہ لیے اس کی طرف لپکا

تو اس نے چشم بے پروا کے اشارے سے مجھے روکا

اور اپنی زلف کو ماتھے پہ لہراتے ہوئے پوچھا

کہو اے اجنبی سائل!

گدائے بے سروساماں!

تمھیں کیا چاہیے ہم سے

میں کہنا چاہتا تھا۔۔۔ عمر گزری جس کی چاہت میں

وہی جب مل گیا تو اور اب

کیا چاہیے مجھ کو

مگر تقریر کی قوت نہ تھی مجھ میں

فقط اک لفظ نکلا تھا لبوں سے کانپتا ڈرتا

جسے امید کم تھی اس کے دل میں بار پانے کی ''محبت'' لفظ تھا میرا

مگر اس نے سُنا ''روٹی''

محبت بے شک فراموش ہو جائے لیکن روٹی کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی۔ بقول شخصے:

چناں قحط سالی در اندر دمشق

کہ یاراں فراموش کروند عشق

عرش صدیقی کی نظموں میں نظریاتی سرحدوں پر انسان دوستی کا تصور شدید تر ہے انھوں نے اپنی نظموں میں اس عقیدے کے فروغ کے لیے بڑی سچی لگن کے ساتھ کوشش کی ہے۔ ان کی ایک نظم ''ہم اندھیروں میں لڑ رہے ہیں'' ان کے مزاج کی آئینہ دار ہے اور عصرِ حاضر کا روحانی المیہ بھی:

لہو یہ کس کا ہے، کون ہے وہ

جسے مری کم نگاہ شمشیر کھا گئی ہے

یہ کون تھا کوئی میرا ساتھی؟

کوئی مرا ہم نصیب پیارا!

کوئی مرا ہم نفس پرانا!

یا میرا دشمن؟

مری ہی مانند خوف کی گہری گھاٹیوں کا شکار کوئی؟

مگر یہ پہچان ہو تو کیسے!

کہ ہم اندھیروں میں لڑ رہے ہیں

عرش صدیقی حقیقت پسند ہیں اس لیے ان کا تصور محبت سطحی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے خالص علمی

انداز سے دیکھتے ہیں۔ عرش مرحوم کے اس نظریے پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف لکھتے ہیں:

''ان کے نزدیک محبت عظیم ہے مگر حقیقت محبت سے بھی عظیم تر ہے اور عرش صدیقی نے اس عظیم تر حقیقت کو کھلی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں بلکہ اپنی نظموں میں جگہ جگہ اس کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ طبقاتی تضادات میں منقسم ایک ایسے معاشرے میں زندہ رہنے پر مجبور ہے جہاں معاشی اور سیاسی تضادات کی طرح محبت کی اکائی بھی میں اور تو کی دل ربائی کے برعکس امیری اور غریبی کی دوئی میں تقسیم ہوتی چلی گئی ہے''۔

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص 82)

عرش صدیقی کے ہاں محبت کے تصور کو سمجھنے کے لیے ان کی نظم ''میں بے ادب تھا'' خاصی اہم ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر آشوب روزگار کے مارے آج کے عاشق کا انداز سمجھا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ غزل بھی مناجات کی طرح لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پوری کی پوری نظم درج کی جاتی ہے:

بہار آئی تو اس نے تحفہ تازہ پھولوں کا مجھے بھیجا
مرا دل جی اٹھا جیسے
کوئی خوابیدہ بستی میں
نیا موسم اتر آئے!
مہک اٹھا مرا بوسیدہ کمرہ ان کی خوشبو سے!
مرے بچوں کے چہروں پر بھی یہ تحفہ
شب تاریک میں تنہا ستارے کی طرح چمکا
اسے دکھ تو ہوا ہوگا
کہ میں نے شکریہ لکھا

نہ یہ پوچھا
کہ تیرا حال کیسا ہے؟
نہ مانگا میں نے گھر کی تیرگی میں چاند ستارے
نہ یہ چاہا کہ وہ پیاسی نگاہوں کو دکھائے جھیل منظر
بہت یہ بے ادب تھا میں
کہ میں بچوں کے سوتے ہی
اٹھا اور اس کے تحفے کو
گلی سے دور بیٹھے اجنبی کے ہاتھ بیچ آیا
کہ اس شب گھر میں گیہوں تھے، نہ چاول تھے

نظم کا آخری مصرعہ بڑی بے رحمی کے ساتھ عشق و محبت کے روایتی تصور کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ اس نظم کے حوالے سے میرزا ادیب کا یہ سوال خاصا چونکا دینے والا ہے۔ اس سوال کا جواب قاری پر چھوڑ دینا مناسب ہوگا:

''یہ گیہوں اور چاول کیوں نہیں تھے۔ شاعر بھی تو اپنے معاشرے ہی کا ایک فرد ہے جس کی بنیادی ضرورتوں سے معاشرہ اور صاحب اقتدار کسی صورت بھی بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ کیا یہ معاشرہ اس اسلامی معاشرے میں سانس لے رہا ہے جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اگر تمھارا ہمسایہ بھوکا ہے تو تم پر رزق حرام ہے؟''

(دنیائے ادب کا عرش ۔ ص44)

لیکن ان معروضات کا مطلب ہرگز نہیں کہ عرش صدیقی نے عہد حاضر میں معاشی مسائل کے شکار انسان کو محبت کے خالص رومانی جذبوں سے ہی دکھایا ہے۔ اس تاثر کو رد کرنے کے لیے ان کی ایک شہرہ آفاق نظم پیش کی جاسکتی ہے۔ ''اسے کہنا'' محبت کی تیز لے پر رقص کرنے کا نام ہے۔ یہ نظم یخ بستہ موسموں میں عشق کی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنانے کا کام دیتی ہے:

اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے

دسمبر کے گزرتے ہی برس اک اور ماضی کی گپھا میں ڈوب جائے گا

اسے کہنا دسمبر لوٹ آئے گا

مگر جو خون سو جائے گا جسموں میں، نہ جاگے گا

اسے کہنا، ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کہرے کی دیواروں میں لرزاں ہے

اسے کہنا شگوفے ٹہنیوں میں سو رہے ہیں

اور ان پر برف کی چادر بچھی ہے

اسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا

تو کیسے برف پگھلے گی!

اسے کہنا کہ لوٹ آئے

یہ نظم ایک بڑے شعری تجربے کی علامت ہے۔

نظم "اپنی مٹی کی خوشبو" ایک رومانوی داستان کو موضوع بناتی ہے۔ نظم کے آغاز میں ایک بستی کا منظر ابھر کا سامنے آتا ہے۔ اس بستی میں ایک مسافر قلیل مدت کے لئے قیام کرتا ہے۔ وقت آنے پر جب وہ اسی بستی کو خیر باد کہنے لگتا ہے تو وہ بھیگی ہوئی آنکھیں اسے رخصت کرتی ہیں۔ یہاں ہجر بڑے درد بھرے انداز میں ماحول کو سوگ وار بنا دیتا ہے۔ ایک مرحلے پر مسافر کو اپنے بزرگوں کا مدفن یاد آتا ہے تو وہ اس بھیگی آنکھوں والی لڑکی کو ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہاں صورت حال بڑی المناک بن جاتی ہے:

وہ اک بت کی طرح، سر کو جھکائے، چپ رہی لیکن

خموشی کو زباں کہیے تو سب کچھ کہہ گئی مجھ سے

جو آنسو اس کی پلکوں سے گرے تھے خشک مٹی پر

انھیں میں نے تڑپتے، سوچتے اور بولتے دیکھا

پھر اک شب اس کے پہلو میں سے اٹھا اور افق میں

ڈوبتی راہوں پہ چلتا اپنے آباء

کی اس مٹی کی خوشبو کے تعاقب میں چلا آیا

جو میرے خوں میں پلتی تھی

مجھے پہلو سے گم پا کر، وہ سادہ، بے زباں لڑکی مگر کیا سوچتی ہوگی

اس نظم کا انجام بعض حوالوں سے ن۔م راشد کی نظم ''مار سیاہ'' جیسا ہے۔لیکن انداز بیاں میں راشد کی نسبت وضعداری دکھائی دیتی ہے۔ڈاکٹر طاہر تونسوی عرش صدیقی کی نظم پر اپنے ایک مضمون میں یوں گویا ہوتے ہیں:

''عرش صدیقی اردو شاعری کا وہ فرہاد ہے جس کے ہاتھ میں تیشہ لفظ ہے اور جس سے وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کے نقش تراش رہا ہے۔اور جو نقش نظموں کی ہیئت میں لحہء موجود تک سامنے آئے ہیں ان کے پس منظر میں عرش صدیقی کی نظمیں تنوع، تحیّر اور اسلوب و معنی کے اعتبار سے نہ صرف انفرادیت کی حامل ہیں بلکہ اردو نظم کو ایک تازہ اور شگفتہ پیرائیہ بیان سے روشناس کرا کر ایک نیا باب شاعری کھولتی ہیں''۔

(دنیائے ادب کا عرش . ص 152)

عرش صدیقی کی نظموں کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پس منظر میں موجود شاعر کا ذہن اپنے باطن میں ایک گہری سنجیدگی اور منطقیت رکھتا ہے۔فی زمانہ یہ رویہ بڑی حد تک نایاب ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ہمارے گروہی تعصب میں بٹی شاعروں ادیبوں کی کمیونٹی نے انھیں وہ مقام نہیں دیا جو انھیں ملنا چاہیے تھا۔سچ تو یہ ہے کہ عرش صدیقی کی نظموں میں تنوع کی وجہ سے وہ حسن پیدا ہو گیا ہے جس نے ان کو ادبی لحاظ سے ''حنوط'' کر دیا ہے۔ان کی چند نظموں کے ٹکڑے دیکھیے۔کیا یہ شاعری معاشرے کی علمی، تہذیبی اور فکری ترقی کے لیے نصب العین کا درجہ نہیں رکھتی؟:

ہمیں خبر ہی نہیں ابھی ہم حقیقتوں سے ادھر کسی دشتِ بے اماں سے رہائی کی راہ ڈھونڈتے ہیں!

زمانے بھر کی صداقتوں کی خبر ہو کیسے

کہ وقت کے دائرے میں غلطاں ہم اپنی اپنی جبلتوں کے محبتوں کے حصار میں ہیں

کہیں یہ محدود حالتوں کے حصار ٹوٹیں تو جان پائیں

کہ جبر کیا اختیار کیا ہے!!!

(جبر کیا اختیار کیا ہے)

☆☆☆☆☆

ہاتھ محنت آشنا تھے

اس لیے بے چین تھے کھلیان بھرنے کے لیے

سر پہ سورج تھا مہکتی آرزو کا ہم سفر

راستے سب منتظر تھے لمس پائے شوق کے

Hasnain Sialvi

ہوش کی حس سے پرے تھا، دشمنوں کا دائرہ

لیکن آنکھیں بند تھیں

اس لیے جب رن پڑا تو دیکھتے ہی دیکھتے

ساعتیں خوشیوں کی کھیتوں میں بکھر کر رہ گئیں

شب نہ تھی لیکن سماں ہر سمت تھا شب خون کا

ہم نے جو بوئی تھیں فصلیں دوسروں نے کاٹ لیں

(جب رن پڑا)

☆☆☆☆☆

پوچھتا کوئی نہیں مجھ سے کہ پچھلے سال جب

سردیوں کی کُہر میں دل کی تپش افسانہ تھی

زرد، مدھم، چاندنی میں اس گلی کی سردائینٹوں پر

محبت کے پرانے تیس برسوں
کی سکوں دشمن کہانی ڈھونڈتا
آخرِ شب کا مسافر کون تھا؟"

(مسافر آخر شب کا)

یہ آخر شب کا مسافر عرش صدیقی ہے جس کی نظمیں اپنے موضوعات، ڈکشن کے آہنگ اور پیش کش کے اعتبار سے اردو شاعری کا نادر نمونہ ہیں۔ وہ ایک توانا فکر کا حامل شاعر ہے۔ اس کی نظموں میں ذات سے لے کر کائنات تک تمام موضوعات مل سکتے ہیں۔ اس پر اس کے اندر کے جینوئن شاعر نے اردو ادب کو بالعموم اور جدید اردو نظم کو بالخصوص وہ اسلوب عطا کیا ہے کہ گہرائی اور اثر آفرینی کے اعتبار سے یہ صنف اب ایک اچھے مستقبل کی وارث بن گئی ہے۔

ڈاکٹر عرش صدیقی کی غزل گوئی

اردو میں غزل ایک ''ہمیشہ بہار'' صنف کے طور پر مقبول رہی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ کبھی بھی اسم بامسمّٰی نہیں رہی۔ کسی بھی غزلیہ مشاعرے میں جب یہ کہہ کر داد دی جاتی ہے کہ ''واہ کیا غزل کا شعر نکالا ہے'' یا ''واہ کیا غزلیہ انداز ہے'' تو اس سے سننے والا اس تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کیا غزل کے دوسرے اشعار غزل کے مزاج سے ہم آہنگی نہ رکھتے تھے۔ غزل کی تعریف ''عورتوں سے باتیں کرنا'' یا ''ہرن کی چیخ'' وغیرہ بھی اس مرحلے پر متعلقہ معیار پر پوری نہیں اترتی۔ حتیٰ کہ ہمارے کلاسیکی شاعری کے خزانے میں سے بھی کئی اشعار ایسے برآمد ہو جائیں گے جو عورتوں سے کی گئی باتیں نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے غزل کو صرف ایک ہئیت قرار دیا ہے۔ اس غزل نے خزاں کے موسم میں بھی ایسے گُل کھلائے ہیں کہ اس سے ایک پورا دور معطر ہو گیا ہے۔ عرش صدیقی صرف ایک غزل گو شاعر ہی نہیں بلکہ ادب کی بہت ساری اصناف میں انھوں نے اپنی ایک علیحدہ پہچان بنائی ہے لیکن یہاں پر ہم صرف ان کی غزل پر بحث کریں گے۔ ڈاکٹر عرش صدیقی کے پہلے شعری مجموعے ''دیدۂ یعقوب'' میں تعداد کے اعتبار سے غزلیں کم ہیں، بظاہر محسوس ہوتا ہے جیسے غزل ان کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ ان کی غزل کا اسلوب اگرچہ روایتی ہے لیکن ان کے اندر ایک جدیدیت کی ہلکی سی لہر دوڑتی دکھائی دیتی ہے۔ بقول یحییٰ امجد:

''عرش صاحب کی شاعری ایک شدید جذباتی اور گہرے عالمانہ کرب کی شاعری ہے، ان کا ذہنی اور جذباتی ادراک انھیں ایک ایسے موڑ پر لایا ہے جہاں کسی شے کی

حقیقت واضح اور نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتی اور وہ قوائے شعور کی نیم ادراکی سے بے قرار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک کرب مسلسل، ایک مستقبل تڑپ اور تلملاہٹ ان کی شاعری کی روح رواں ہے یوں بھی ہر رومانی شاعر اشیاء کی حقیقتوں اور ماہیتوں کے بارے میں سرگرداں رہتا ہے اور باتوں کو پوری طرح نہ سمجھ کر بے چین ہو جاتا ہے۔ حال سے غیر مطمئن اور کسی حسین مستقبل کا تمنائی رہتا ہے۔ جہاں وہ سب اقدار سرخرو ہوں گی۔ جن کے لیے وہ عمر بھر دیدہ دل فرشِ راہ کیے رہتا ہے"۔

(دیدنہ یعقوب کا شاعر۔ ص 212)

خود شاعری کے بارے میں عرش صدیقی کا نقطہ نظر بڑا واضح اور دوٹوک ہے۔ وہ اپنے شعری نظریے پر کسی بھی قسم کی ملمع کاری کیے بغیر واشگاف انداز میں اپنی رائے دیتے ہیں۔ اردو غزل کے فکری سرمائے میں اہم اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ عرش صدیقی نے فنی طور پر بھی اسے اپنی توجہ کا مستحق سمجھا ہے۔ پھر انھوں نے اپنی تخلیقات پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے، کہتے ہیں:

"میں اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتا کہ فنکار اپنا نقاد خود نہیں ہو سکتا۔ بہت سے فنکار واقعی ایسا نہیں کر سکتے لیکن دوسرے، بہت سے اہلیت نہیں رکھتے۔ تمام ایسے فنکار جو اپنی تخلیق سے شدید جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں اور اسے اولاد کی طرح عزیز سمجھتے ہیں ان سے خود احتسابی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میں فنکاروں کے اس گروہ سے نہیں ہوں۔ میں اپنی شاعری سے بے تعلق نہیں ہو سکتا لیکن میں ان سے شدید جذباتی تعلق بھی نہیں رکھتا کہ ان سے نامطمئن ہونے پر انھیں مسترد نہ کر سکوں"۔

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص 129)

اس اقتباس سے واضح طور پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تنقید اور تخلیق کے باہمی ربط سے بڑی اچھی طرح آگاہ ہیں۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے عہد کی تنقیدی سوچ کے زیر اثر انھوں نے روح عصر کی آواز پر مشتمل شاعری کی۔ ان کے ہاں نہ تو کلاسیکی شعراء کی ہی خالص معاملہ بندی یا استادانہ مہارت کا اظہار ملتا ہے اور نہ ہی وہ میر کے قبیلے کے لوگوں کی طرح قنوطی واقع ہوئے

ہیں۔ان کے نزدیک آنکھوں کا مقصد صرف رونا ہی نہیں۔انکی غزل میں زندگی کے حقائق کو ان کی تمام نا آسودگیوں اور ناانصافیوں پر مشتمل اضطراب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ان کی غزل کی تہہ میں موجود فکری اور تجرباتی شعور ایک ایسی قوت کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ وہ سیدھا سادھا اعلیٰ انسانی اقدار کے مسخ ہونے کا المیہ بن گیا ہے۔وہ سچائیوں کی تلاش میں بند کمروں میں بیٹھ کر ''فسانہء آزاد'' پڑھنے کی بجائے ''انسان'' اور انسانی کرب واندوہ کو اساس بناتے ہیں اور اسے فلسفیانہ اسلوب کی تہہ چڑھائے بغیر قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔چند اشعار دیکھیں:

ملتا نہیں بازار سے پیراہنِ یوسف
یعقوب ہوں تاریکی کنعاں میں پڑا ہوں

ہم نے لفظوں سے نہیں بہنے دیا سیل الم
کون رکھ سکتا ہے یوں دل میں سمندر باندھ کر

ہاں سمندر میں اتر لیکن ابھرنے کی بھی سوچ
ڈوبنے سے پہلے گہرائی کا اندازہ لگا

بس یونہی تنہا رہوں گا اس سفر میں عمر بھر
جس طرف کوئی نہیں جاتا ادھر جاتا ہوں

جیتے ہیں سب تو کھل گئے اوصاف جہاں پر
مر جاتے تو اچھا تھا کہ رسوا تو نہ ہوتے

ہم آج شہر یار کے معتوب ہیں تو کیا
ہر دم وہ قصرِ خوف میں ترساں ہمیں سے ہے

اور ان اشعار میں تو معاشی مسائل کو عشق سے مربوط کر دیا گیا ہے۔صورت حال خاصی دلچسپ

اور کچھ کچھ مضحکہ خیز بھی ہے:

وہ عیادت کو تو آیا تھا مگر جاتے ہوئے
اپنی تصویریں بھی کمرے سے اٹھا کر لے گیا

میں کھڑا فٹ پاتھ پر کرتا رہا رکشہ تلاش
میرا دشمن اس کو موٹر میں بٹھا کر لے گیا

عرش صدیقی کی غزل کے اسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر طاہر تونسوی کہتے ہیں:

''عرش صدیقی کی غزل میں اگرچہ شوخ رنگ زیادہ نہیں تاہم ان کے ہاں موضوعات کی جو توانائی ہے اس میں ان کی ذات کا حوالہ ہر جگہ موجود ہے۔ اسی طرح شعوری رو کا توانا احساس بھی لب و لہجے میں تمکنت کے ساتھ ساتھ شادابِ اظہار میں معاونت کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ کہیں پر بھی تضادات کی کیفیت نہیں''۔

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص 157)

عرش صدیقی کی غزلوں میں آپ بیتی بھی ہے، نظریہ بھی، فلسفہ بھی ہے، تاریخ بھی، سیاست بھی، اور علوم بھی۔ قریب قریب یہی صفات ہیں جو ان کی غزلوں کو اردو کی روایتی غزل سے جدا کرتی ہیں اور ان کی ساخت میں وہ عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ جن سے غزل کا روپ سروپ اور اوج سروج زیادہ خوبصورتی کے ساتھ قاری پر واضح ہوتا ہے۔ ان کی غزل سے لطف وحظ اٹھانے کی بجائے فکر انگیزی کشید کی جا سکتی ہے۔ اکثر غزلوں میں لفظوں کی ترتیب میں ان کا صوتی عنصر انہیں موسیقی کے قریب تو نہیں کرتا لیکن ان میں روانی اور سلاست آ جاتی ہے۔

عرش صدیقی کی غزلیں ان کی نظموں سے بہت کم ہیں۔ اور ان غزلوں کے مطالعے اور تجزیے سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان کے مجموعوں میں غزلیں کیوں کم ہیں؟ اور بالآخر آسانی کے ساتھ یہ

نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ تخلیق کار جس لسانی سسٹم میں جکڑا ہوا ہے اس میں اس نے شاعری کا آغاز تو شاید غزل سے ہی کیا ہوگا لیکن روایت سے انحراف کے سبب بات کو بہت جلد جدیدیت کے پیرائے میں ڈھالنے کی کوشش میں نظم کی طرف متوجہ ہو گیا ہوگا۔ شاید اس کی ایک وجہ عرش صاحب کی ہمہ جہت شخصیت بھی بنی ہوگی جس نے انھیں غزل کو کم وقت دینے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ لیکن ان معروضات سے یہ مطلب نہ نکال لیا جائے کہ ہمارا تخلیق کار اس صنف کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا۔ عرش صدیقی نے اپنے اسلوب اور لب و لہجے میں جدید خیالات کو اس ڈھنگ سے ادا کیا ہے کہ ان کی غزل شعورِ ذات کا مکمل منظر نامہ بنتی دکھائی دیتی ہے۔ البتہ اس میں ایک درمیانی راستہ ہے جو غزل کے ساتھ ساتھ نظم، دوہا نگاری، افسانہ نگاری اور تنقید کے شہر کی طرف بھی جاتا ہے۔ قدم ادھر اٹھتے ہیں تو ادھر کا خیال آتا ہے۔ وہاں سے پلٹتے ہیں تو دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ دراصل عرش صدیقی اپنی عملی زندگی میں ایک ذمہ دار، وضع دار اور خود احتسابی کے قائل شخص تھے اس لیے ان کی شاعری میں بھی (بالخصوص غزل میں) یہ شائستہ رویہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ ''غزل'' کا پورا شاعر بننے کے لیے اپنی آشفتہ سری کا مداوا کبھی کبھار پتھر کھانے سے بھی کیا جاتا ہے۔ وزیری پانی پتی نے اس سلسلے میں زیادہ خوبصورت بات کی ہے، کہتے ہیں:

> ''غزل گو شعرا دراصل ایک فریبِ معنوی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبوبوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اسی اعتبار سے جمالیاتی عنصر پیدا ہوگا۔ یہ اصل تعدد ازدواج (POLY GAMY) لطافت کا نہیں بلکہ خیانت کا عنصر پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ نصیب دشمناں عرش صاحب کی غزل میں یہ عنصر موجود ہے بلکہ عام تازہ واردانِ غزل کو اس اصول سے استفادہ کرنا چاہیے۔ عرش صدیقی کی شاعری میں عنصرِ رجائیت کا فقدان ہے، لیکن یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ کیوں کہ شوپن ہار کے خیال میں رجائیت ایک حماقت ہے، مجھے شوپن ہار سے

اتفاق نہیں ہے تاہم کسی فن کار کو جو طبعاً رجائی نہ ہو محض ستائشِ خلق کے لیے رجائیت
پسندی کا بے جا مظاہرہ نہ کرنا چاہیے کیوں کہ اس سے مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی
ہے، اس طرح محض تقلیدی طور پر یاس وحزینت کے اظہار سے بھی لغویت ظاہر ہوتی
ہے۔ عرش کو غمِ حیات اور کشاکشِ ہستی سے زیادہ سابقہ پڑا ہے"۔

(عرش صدیقی کی غزل گوئی ۔ ص 381)

بلاشبہ عرش صدیقی نے اس نوع کے غزل گو شعراء سے دوری اختیار کیے رکھی ہے جو آلودگی میں دانش جوئی کی تلاش کرتے ہیں اور خود ستائشی میں عظمت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ عرش صاحب کی غزل میں حقیقت کے انھی رنگوں کی چند جھلکیاں دیکھنے سے ان کے شعری مقام کا معترف ہونا پڑتا ہے:

حال دل کہہ کے ہوئے اور گرفتار الم
ہم نہ کہتے تھے کہ یوں درد فزوں تر ہو گا

دل ہے کہیں، دماغ کہیں اور ہم کہیں
شیرازۂ حیات بہم ہو تو کس طرح

تیرے بغیر وہ بدلی فضائے زیست کہ ہم
اسیرِ حلقۂ زنجیرِ غم رہے برسوں

آج ہر شے سے بد گماں ہیں ہم
مت ہمیں اے غمِ زمانہ چھیڑ

قطرہ ہوں میں دریا میں مجھے کچھ نہیں معلوم
ہمراہ مرے کون ہے، میں کس سے جدا ہوں

طوفانِ الم کیوں مجھے ساحل پہ اتارا !
میں شور تلاطم سے ہراساں تو نہیں تھا

اس دورِ خرابی میں جب تخلیقیت کا قتلِ عام ہو رہا تھا۔ عرش صدیقی نے ناسامعد حالات کے باوجود خود کو جمود اور تعطل کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ''دورِ ضیاع'' کی کرشمہ سازیاں اپنا کام دکھا رہی تھیں۔ حوادث اور انتشار کے دور میں بڑے بڑے شعراء علامتی انداز میں شہر آشوب لکھ رہے تھے۔ اس دور میں عرش صدیقی دونوں محاذوں پر ڈٹے رہے۔ انھوں نے اسی دور میں ادبی محاذ پر ایک انقلابی منشور کا اعلان کیا۔ ہر نئے لکھنے والے کو جدت پسند اور دانش جو بنانے کی جستجو کی۔ اپنی تخلیق کاری میں کہیں پر بھی ابلاغ یا معانی کو راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ ان کے عصری وجدان اور شعور نے انھیں ادب کے زندگی سے گہرے تعلق پر مبنی نظریے کے پرچار پر آمادہ کیا۔ اپنی غزل میں بھی وہ اس موضوع کے حوالے سے متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی غزل کے کئی اشعار معاشرے کے اجتماعی شعور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کا غم، غمِ ذات نہیں بلکہ غمِ کائنات ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار بہ طور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں:

کیوں اس نے مجھے عظمتِ قرآں کی قسم دی
وہ رہزنِ ایمان مسلماں تو نہیں تھا

تھا دل بھی کبھی شہرِ تمنا سے مماثل
یہ قریہ ہمیشہ سے بیاباں تو نہیں تھا

دل سے زباں، زباں سے چھنی طاقتِ سخن
مائل ادھر مزاجِ صنم ہو تو کس طرح

کیوں ضد ہے شہر یار کو اے عرش اس قدر
یہ سر کہ وقفِ دار ہے خم ہو تو کس طرح

مانوس ہو گئے ہیں، اندھے پرانے گھر سے
باہر نہیں نکلتے ہم روشنی کے ڈر سے

دیکھا نہ ہم نے یاں بھی شجر کوئی سایہ دار
یعنی دیار عشق بیاباں سے کم نہ تھا

اردو غزل کے مزاج میں جو حسن اور دل کشی پیدا ہوئی ہے۔ اس کی ایک وجہ نئے تجربات کا اثر و نفوذ ہے۔ جدید موضوعات نے غزل کو جو کچھ دیا ہے اس کا اثر طرز اظہار اور اسلوب بیان پر بھی پڑا ہے۔ عرش صدیقی نے فکری وفنی مہارت کے ساتھ اردو غزل میں وہ بے پناہ کاٹ اور اثر آفرینی بھی پیدا کی ہے جس سے کسی طور بھی انکار ممکن نہیں۔ ان کے دونوں شعری مجموعوں میں شامل غزلیں بعض نئی جہات کا اضافہ کرتی ہیں۔ اشعار کی قرأت کے بعد یوں لگتا ہے کہ جیسے عرش صدیقی کے تخلیقی وجدان نے ستاروں کو چھو لیا ہے:

اپنے لیے تھا باعثِ آبادیء نظر
بے ساختہ گریز جو پیاں سے کم نہ تھا

رہتا ہوں بگولوں کی طرح رقص میں بے تاب
اے ہم نفسو میں دلِ صحرا سے اٹھا ہوں

کیوں راستہ دیکھا کیا اس کا میں سر شام
بے درد کا مجھ سے کوئی پیاں تو نہیں تھا

دل ٹوٹ تو جاتا ہے پہ گریہ نہیں کرتا
کیا ڈر ہے کہ رہتی ہے وفا سہمی ہوئی سی

کیا کیا نہ گل کھلیں گے کیا کیا نہ جشن ہوں گے
اس کشتِ آرزو میں بادل کبھی جو برسے

کیوں کر کہیں کہ درد نہیں حاصلِ حیات
پیشِ نظر جو ہے وہ عدم ہو تو کس طرح

ڈاکٹر فاروق عثمان نے ایک جگہ عرش صدیقی مرحوم کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک حساس انسان اپنی حیات کے ہر عشرے میں اپنے آپ کو بالکل ایک نئی دنیا میں پاتا ہے۔ اس کے اندر ایک نیا تناظر جنم لیتا ہے اور یوں اس کا فن مستقلاً نئی سے نئی جہتوں کا احساس دلاتا رہتا ہے لیکن ایسے لوگ ہوتے بہت کم ہیں جو بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ زندگی کے تغیرات کے عادی ہو سکیں کیوں کہ یہ وہ صورت حال ہے جو ایک زبردست تجسس اور جرأت کی متقاضی ہے۔۔۔ عرش کے ہاں تغیرات کا ادراک بھی ہے اور قبولیت کے جرأت بھی یہی وجہ ہے کہ ان کا نیا مجموعہ اسلوب اور موضوع دونوں اعتبار سے ان کے پہلے مجموعے کا نقش ثانی ہرگز نہیں''۔

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص 107)

غزل میں مسلسل تخلیقی ارتقاء دکھائی دیتا ہے۔ موضوعات عرش صدیقی کے اعتبار سے متنوع اشعار ہیں جو تخلیقی لحاظ سے ان کے اسلوب کو اردو ادب میں ایک مرقع کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے تجربات ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے، تخلیق کار کا کرب عظیم ہر آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن عرش مرحوم کا روگ تخلیق کار کے ذہن سے بھی ماورا ہے۔ وہ ایک خاص سطح پر رہ کر علم و ادب کی آبیاری کرنے والے انسان تھے یہی پہلوان کی غزل میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ حقائق سے چشم پوشی کر کے اپنی اہمیت ثابت کرنے کا ہنر نہ جانتے تھے، اس لیے انھوں نے روایتی قسم کے تصورات سے واضح طور پر بغاوت کرتے ہوئے اپنے موقف کا یوں اظہار کیا۔

1۔ شاعری کو الہام کا درجہ اور ''جزو ایست پیغمبری'' قرار دینا غلط ہے۔ بلکہ یہ شعور کا کرشمہ ہے اور یہ بہت اہم ہے۔

2۔ ایک شاعر اپنا نقاد خود بھی ہو سکتا ہے۔

اوپر دیئے گئے ان خیالات سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن عرش مرحوم کی فکر کے پس منظر میں موجود علمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کی شاعری میں بھی اسی شعوری کوشش کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ ان اشعار میں فکری ارتقاء اور علم و دانش کے اظہار کے حوالے سے کی جانے والی کوشش واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے:

ہر آرزو کو اپنی نہایت کی فکر تھی
بازار شوق حشر کے میداں سے کم نہیں

نا طاقتیِ جاں کی شکایت کا نہیں ہوش
میں قطرہ ہوں اور وقت کے دریا میں گرا ہوں

میں شہر کو کہتا ہوں بیاباں کہ یہاں بھی
سایہ تری دیوار کا کب سر پہ پڑا ہے

اک لمحہ ٹھہر مجھ کو ہم راہ لیے چل
اے لیلیٰ ہستی، ترا نقش کفِ پا ہوں

دل ہے کہیں، دماغ کہیں اور ہم کہیں
شیرازۂ حیات بہم ہو تو کس طرح

کیوں مطمئن کھڑے ہو آسودگانِ ساحل
دریا کا زور دیکھو، گہرائی میں اتر کے

عرش صدیقی نے اپنی غزل میں بعض مظاہر فطرت اور ان سے نسبی اور فطری طور پر جڑی ہوئی اشیاء کو اپنی غزل کی بنیادی علامت بنایا ہے۔ یہ اشیاء اس طرح ہماری زندگی میں دخیل ہیں کہ

ہوں تو ہونے کا احساس نہ ہو اور نہ ہوں تو زندگی کی گاڑی کا پہیہ جام ہو جائے۔ اس کے علاوہ غزل کے بعض روایتی موضوعات کو نئی خلعت پہنانے کی سعی بھی کی گئی ہے:

محروم سکوں پھرتا ہوں آوارہ و بے چین
لیکن گل و گلشن کے لیے موجِ ہوا ہوں

(ھوا)

کیا کیا بسی تھیں صورتیں دامانِ خواب میں
دشتِ خیال ، شہرِ نگاراں سے کم نہ تھا

(شھر)

دیکھا نہ ہم نے یاں بھی شجر کوئی سایہ دار
یعنی دیارِ عشق ، بیاباں سے کم نہ تھا

(عشق)

دل کش بہت ہے ترک تعلق کا مشورہ
خود پر مگر یہ طرفہ ستم ہو تو کس طرح

(ستم)

کیا کیا نہ گل کھلیں گے کیا کیا نہ جشن ہوں گے
اس کشتِ آرزو میں بادل کبھی جو برسے

(آرزو)

راہوں میں زندگی کی لٹی سب متاعِ ہوش
الجھاؤ ان کا زلفِ پریشاں سے کم نہ تھا

(زندگی)

اردو غزل کی روایت میں عرش صدیقی کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ پچھلی صدی کے اہم

غزل گو شعراء کی ایک فہرست بنائی جائے تو انھیں اس میں جگہ دینا پڑے گی۔ لیکن اس کا مطلب ہر گز نہیں کہ وہ غزل گوئی کے تمام تقاضوں پر پورا اترتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بعض نقائص اور فکری تسامحات بھی ہیں۔ جن کا ذکر بھی آنا ضروری ہے۔ بعض اشعار میں ایک عجیب سے عدم توازن کا احساس ہوتا ہے۔ غزل کا ایک خوبصورت شعر نجانے کتنے مسیحاؤں کو مصلوب کر کے تخلیق کیا جاتا ہے۔ عرش صدیقی اس مرحلے پر ''رسمِ ورہ دنیا'' نبھانے لگ جاتے ہیں۔ بعض اشعار بھرتی کے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً دو شعر دیکھیے:

شہرہ ترا گیا مرے نغموں کے ساتھ ساتھ
عالم کو تیری دید کا ارماں ہمیں سے ہے

ہر لقمے پہ کھٹکا ہے کہیں یہ بھی نہ چھن جائے
معدے میں اترتی ہے غذا سہمی ہوئی سی

بعض اشعار میں مشاہیر کا لہجہ اپنانے کی شعوری کوشش دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً

بے جان ہوں پر گُل ہوں، مجھے خاک پہ مت پھینک
اے باد صبا میں ترے جھولے میں پلا ہوں

(عرش صدیقی)

اس موضوع پر جوش ملیح آبادی کی ایک نظم دیکھیے۔ لفاظی اور ماحول کس قدر مماثلت رکھتا ہے:

ہوتے ہیں پائمال تو کہتے ہیں زرد پھول
خوبانِ بوستاں میں ہمارا بھی تھا شمول
اے راہرو نہ ڈال ہمارے سروں پہ دھول
ہر چند انجمن کے نکالے ہوئے ہیں ہم
لیکن صبا کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم

(جوش ملیح آبادی)

ایک شعر میں سیال حالت میں پیے جانے والے زہر کو نگلنے کی بات کی گئی ہے جو یقیناً بڑا استم ہے:

زہر تھا زندگی کے کوزے میں
جانتے تھے مگر نگلتے رہے

اور اب آخر میں عرش صدیقی کے چند خوبصورت اشعار:

اب تک ہمیں گماں ہے صحرا پہ گلستاں کا
اک بار بے ارادہ گزرا تھا وہ ادھر سے

رنگینیِ جمال کی سرحد نہ تھی کوئی
اور حوصلہ بھی حیطۂ امکاں سے کم نہ تھا

اے ضبطِ نظر دے مرے ایماں کی گواہی
تو ہی تو سمجھتا ہے کہ میں کون ہوں کیا ہوں

کیوں اس نے نہ کی مجھ سے سر بزم کوئی بات
میں سنگِ ملامت سے گریزاں تو نہیں تھا

ہم کو نہ تھی جنوں میں تمیزِ دماغ و دل
دامن کا چاک، چاک گریباں سے کم نہ تھا

ڈاکٹر عرش صدیقی کی دوہا نگاری

دوہا اگرچہ ہندی کی معروف صنفِ سخن ہے لیکن ڈاکٹر عرش صدیقی کے دوہے، تہذیبی امتزاج کے بعد وجود میں آتے ہیں۔ انھوں نے ہندی روایات سے استفادہ کرتے ہوئے اسے اردو کی ایک مقبول صنف بنادیا ہے۔ یوں ہمارے شعری سرمائے میں اضافہ ہوا ہے۔ ہندی شاعری سے مسلمانوں کے استفادے اور خود ان کی ہندی شعر گوئی کی روایت نئی نہیں ہے۔ سعد سلمان لاہوری سے بھی ہندوی میں شعر کہنا منسوب ہے۔ اس سلسلے میں امیر خسرو کی ''غرۃ الکمال'' میں دی جانے والی گواہی اہمیت کی حامل ہے۔ بعض مسلمان شعراء تو اس روایت کو فروغ دینے کی وجہ سے ہندی شاعری کی تاریخ کا اہم حصہ بن گئے، جہاں تلسی داس، چندر بردائی، سورداس، کنگ کوی کیشو داس، متی رام، سیناپتی، بہاری لال چوبے، دیودت سندر، گھنانند، بھوش، بہار تیندو ہریش چندر، سمترا نندن پنت، نرالا اور مہادیوی رو ما وغیرہ کو ہندی شاعری میں اہمیت حاصل ہے وہاں خسرو، کبیر، خان خاناں، فیضی، ملک محمد جائسی، قطبن، منجھن، عثمان، شیخ نبی، سید ابراہیم، رس کھان، سید غلام رسول علی رس لین، طالب علی رس نائک، قاسم شاہ، نور محمد، عبدالرحمٰن، عالم شیخ اور دوسرے متعدد مسلمان شعراء کی خدمات سے بھی اس روایت کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

جدید دور میں اس روپ کی کسی حد تک توسیع ہمیں ڈاکٹر عرش صدیقی کے دوہوں میں ملتی ہے۔ ان دوہوں میں ہندی آمیزش، تہذیبی اختلاط کی روایت کی شمولیت اور اس نوع کی دیگر شعوری کوششوں کے باوجود وسط ایشیاء کے تہذیبی تصورات ایک نئے پس منظر کے ساتھ ہماری زندگیوں

سے ہم آہنگ ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ''کملی میں بارات'' ڈاکٹر عرش صدیقی کے دوہوں کا مجموعہ ہے اس میں شامل کیے گئے دوہوں کی تعداد 129 ہے۔ اپنے دوہوں میں ڈاکٹر عرش صدیقی تتبع کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ غزل، نظم اور افسانہ نگاری کے میدان میں پرچم گاڑ لینے کے بعد ڈاکٹر مرحوم دوہا نگاری کی طرف راغب ہوئے۔ ان دوہوں کو ابتدا میں مختلف رسائل و جرائد میں عادل فقیر کے فرضی نام سے شائع کیا گیا۔ ناصر بشیر کو دیے جانے والے ایک انٹرویو میں عرش صدیقی اپنے دوہوں کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں یونیورسٹی ملازمت کے دوران انتہائی تلخ تجربات سے گزرا۔ میں نے دیکھا کہ زندگی میں کہیں بھی انصاف نہیں ہے۔ سو میں نے عادل فقیر کے نام سے دوہے لکھے، جو ''امروز'' میں شائع ہوتے رہے۔ میرے قریبی دوستوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ میں لکھ رہا ہوں۔ جب اردو اکیڈمی میں میں نے دوہے پڑھے تو لوگوں پر انکشاف ہوا کہ عادل فقیر کے نام سے میں دوہے لکھتا رہا ہوں۔ عادل فقیر نام اس لیے رکھا کہ عادل عدل کرنے والا اور فقیر عدل طلب کرنے والا میں نے عادل اور فقیر کو موضوع بنا کر دوہے لکھے۔ جن میں دینی اور اخلاقی موضوع غالب ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ ان موضوعات پر دوہے نہیں لکھے گئے''۔

(روزنامہ پاکستان۔ ادبی صفحہ)

فنی ترتیب کے لحاظ سے دوہے میں بھی ہندی ماتراؤں کی تعداد ترتیب کی پابندی نہیں، عروضی اعتبار سے عرش صدیقی نے جمیل الدین عالی اور خواجہ دل محمد کی پیروی کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''میں نے اب تک دو بحروں میں دوہے کہے ہیں، ایک بحر چھے بار فعلن اور ایک بار فع یا فاع ہے دوسری بحر کے ارکان فعلن فعلن فاعلن فعلن فعلن فع یا فاع ہیں۔ میں نے اول الذکر بحر کا نام عالی چھند رکھا ہے اور دوسری بحر کو خواجہ دل محمد چھند

کے نام سے پکارتا ہوں۔ میں نے دوہوں پر چار طویل مضمون بھی لکھے ہیں جن میں
ان دونوں بحروں کا انھی ناموں سے ذکر کیا ہے"۔

(روزنامہ پاکستان ۔ ادبی صفحہ)

ڈاکٹر عرش صدیقی نے اپنے دوہوں میں متنوع موضوعات کو استعمال کیا ہے۔ انھوں نے بلاشبہ جمیل الدین عالی کے دوہوں سے رنگ لیے ہیں۔ لیکن "پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقاء" میں انھوں نے عالی جی کے دوہوں کے حوالے سے یہ بحث بھی چھیڑی ہے کہ وہ لوگ جو عالی کو ان کی مخصوص بحر "فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعل" کے استعمال کی وجہ سے دوہا نگار نہیں مانتے اس کی اصل وجہ کیا ہے۔ دوہے کی روایت سے انحراف کے سلسلے میں ڈاکٹر عرش صدیقی ایک باغی کے روپ میں ابھرتے ہیں۔ اس بارے میں ان کے کٹیلے جملے دیکھیے:

"اگر ہمارے بزرگ غاروں میں رہتے تھے، کچا گوشت اور کچی سبزیاں کھاتے تھے ،گھوڑوں، گدھوں اور بیلوں پر سفر کرتے تھے۔ زندگی بھر شکار پر گزارہ کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بھی جنگلوں کا رخ کریں، گھاس چریں، گھوڑوں پر بیٹھ کر تیر کمان کندھے پر لٹکا کر بارہ سنگھے کے شکار کو نکل کھڑے ہوں"۔

(پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقا۔ ص 28)

یہی نہیں کہ اس سے چند قدم آگے بڑھ کر وہ اپنی جدت دوستی کا ثبوت یوں دیتے ہیں؛

"میری تجویز ہے کہ پاکستان میں اردو دوہے کے دو عظیم معماروں اور محسنوں اور معماروں کی خدمات کے اعتراف میں فعلن فعلن فاعلن فعلن فعلن فاع (فع) والی بحر کو خواجہ دل محمد چھند اور فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع (فاع) والی بحر کو عالی چھند کا نام دے دیا جائے میں آئندہ ان بحروں کے لیے یہی نام استعمال کروں گا"۔

(دنیائے ادب کراچی ۔ عالی نمبر ۔ص426)

ڈاکٹر عرش صدیقی کے ہاں اردو دوہا نگاری کے حوالے ایک تنقیدی شعور دکھائی دیتا ہے اسی

تنقیدی شعور نے آگے چل کے بہ طور دوہا نگار انھیں ملکی سطح پر متعارف کروایا ہے۔ جب ہم ڈاکٹر عرش صدیقی کے دوہوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک خاص قسم کی داخلی رومانویت دکھائی دینے کے بجائے ان دوہوں میں بصری شعور کی فراوانی نظر آتی ہے۔ یہ عصری احساس ایک ''موجِ بے بحر'' کی طرح اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ ڈاکٹر عرش صدیقی کے دوہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر توصیف تبسم کہتے ہیں:

''کملی میں بارات میں دوہوں کی تعداد 129 ہے۔ ان دوہوں میں صرف اخلاقی نکات اور پند و نصائح بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں نک سک، داننگ درپن، اور سنگھار اور نایکا بھید، سے شعوری گریز کیا گیا ہے۔ اس اقدام سے اگر ان دوہوں میں ایک طرف فکری گہرائی پیدا ہوئی ہے تو دوسری طرف یہ دوہے اس رس سے بہ منزلہ دور محسوس ہوتے ہیں جو فطرت انسانی میں دور تک سرایت کیے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دوہوں میں شاعری کے ایک عام قاری کو معتد بہ دل کشی کی کمی کا احساس ضرور ہوگا مگر وہ لوگ جو شاعری کو عالی اقدار کا ترجمان دیکھنا چاہتے ہیں وہ ان دوہوں کو ذوق و شوق سے پڑھیں گے''

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص 90)

ڈاکٹر توصیف تبسم کی اس بات سے اختلاف ممکن نہیں کہ عرش صدیقی نے اپنے دوہوں میں زندگی کی ان عظیم قدروں کو پیش کرنے کی سعی کی ہے جو قدیم ہندی روایت میں آنکھیں کھولتی ہے اور ہند المانی تہذیب کے زیر اثر جوان ہوتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

عادل جب دکھ آپڑیں تب چپ لیجے سادھ
جیون میں دکھ سکھ ملیں، مانو آدھوں آدھ

پل پل چولا بدلے عادل، کیا مایا، کیا روپ
جب تک دکھے سورج، تب تک چمکے سر پر دھوپ

دل سے چھینی کامنا ، جسم پہ ڈالے لیر
آخر خود ہی آگری پاؤں میں تقدیر

عادل تیرا عدل ترازو ، سو دھوکوں کا ایک
اک جانب سے ڈنڈی چھوٹی ، اک پلڑی میں چھیک

عرش صدیقی کے دوہوں میں ایک خاص قسم کی جدت ہے، دوہا دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب کہ خیال کے اعتبار سے اسے ایک مکمل اکائی کا درجہ حاصل ہے۔ جس طرح غزل کے ہر شعر کو اپنی جگہ پر کامل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غزل میں غزل مسلسل یا قطعہ بند وغیرہ کی شکل میں تسلسل ہو سکتا ہے جب کہ دوہے میں معاملہ دوسرا ہے۔ اس میں تسلسل بیان کی اجازت نہیں۔ ڈاکٹر عرش صدیقی کے ہاں کمال جدت یہ ہے کہ بعض دوہے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے اسلوب کے لحاظ سے باہم مربوط ہیں:

عادل بھر بھر جھولی جائیں عدل سے تیرے یار
تو نے فقیر کو کیوں ٹھکرایا ، جیے تری سرکار

عادل عادل کہتے بیتے ، دن ہفتے اور سال
عادل تھا ازلوں کا بہرا ، سنتا کس کا حال

اک تقدیر کی باگ ہلائے ایک پھرے دل گیر
کہنے کو انسان ہیں دونو، عادل اور فقیر

عرش صدیقی کے دوہوں کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ ہندی کے ثقیل اور بوجھل الفاظ کم سے کم استعمال کریں۔ ان دوہوں میں ہلکی اور سادہ زبان برتی گئی ہے۔ شاعر نے اردو کی فضا کو برقرار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں دوہا ایک نئے انداز کا چغہ پہن کر نمودار ہوتا ہے۔ لفاظی اور ہیئت کے حوالے سے ان

دوہوں میں مشکل ہی سے ایسی کوئی بات مل سکے گی جو خالص روایت سے متعلق ہو۔ زبان کے عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ عرش صدیقی نے اپنے لہجے میں خاص قسم کی مٹھاس، اسلوب بیان میں چاشنی اور لوچ کے ساتھ ساتھ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے والے عناصر بھی پیدا کیے ہیں۔ محسوس یوں ہوتا ہے کہ اپنے خیالات وافکار کو پیش کرنے میں انھیں کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ چند مثالیں دیکھیے:

تو نے فقیر کو بھیک نہ ڈالی، دیکھا نہ اس کی اور
یہ کیسا انصاف ہے عادل ـــ عادل اور کٹھور!

اس عادل کو بھول گیا تو جس کا احمدؐ نام
جس کا عدل محبت، جس کا فیصل قول اسلام

چور کو بھی حاصل تھے عادل اس کے کرم کے سائے
تو نے چور کے بیوی بچے گلیوں میں بھٹکائے

میں نے دیا فقیری والا پھر سے لیا سنبھال
دور ہوئے جگ کی راہوں سے اندھیاروں کے جال

ہم ہیں فقیر مگر رکھتے ہیں، اپنی سی اک ساکھ
اپنی نظر میں ایک ہیں سارے...... ہیرا، موتی، راکھ

دوہا بہ طور صنف کے ہندی ادب میں نہایت اہم تصور کی جاتی ہے۔ ادیب سہیل اس پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہندی میں غزل کی طرح دوہے کی یکتائیت اس لیے قائم نہیں ہو سکی کہ ایک بہت ہی لوچ دار اور Erotic صنف گیت کے نام سے پہلے ہی سے موجود تھی اور اس کے چاہے جانے کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ گیت کے مقابلے میں

دوہے کے بارے میں ایک رکاوٹ یہ بھی تھی کہ دوہے کا غالب مزاج بھگتی اور تصوف کا ہے''۔

(اردو دوہے کا ارتقا. ص 16)

دوہے کی مقبولیت میں کمی کا سبب گیت کی صنف بنی، لیکن یہ صنف مختصر ہونے کے باوجود دو لسانی سطوح پر گامزن ہے۔ اس کا ایک سرایا نقطہ تو سنسکرت سے جا ملتا ہے اور دوسرا وہ لسانی دائرہ ہے جس کی ابتدا مسعود سعد سلمان کے دور سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عرش صدیقی نے دوہے کے احیاء کی اپنی سی کوشش کرتے وقت اس نوع کے معاملات و مسائل کا بہ غور مطالعہ کیا ہے اس لیے انھوں نے اس میں فقط گیت کے ارضی پہلو ہی سمونے کی کوشش نہیں کی بلکہ نغمہ و شعر کو شامل کر کے اسی کے پہلو سے غم عشق کے ساتھ ساتھ غمِ روزگار جیسے موضوعات کو بھی کشید کرنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے:

عدل بڑا ہے، عدل کی کرسی، میری پہنچ سے دور
کھاٹ فقیر کی عادل مجھ کو، عظمت، کرسی، طور

عدل ملے تو گر ہیں اپنے بخت کی بھی کھل جائیں
دے جو فقیر کو کرسی، عادل ایسا کہاں سے لائیں

دفتر دفتر عدل کچہری، آنکھوں آنکھوں خواب
کوچہ کوچہ عدل کٹہرے، عدل مگر نایاب

عادل خلقت شور مچائے، ہوا ہوئے سنجوگ
نفرت کے دشمن ٹکڑوں میں، بٹے ہوئے ہیں لوگ

عدل دکان کا مال بکاؤ، خالی ہاتھ فقیر
اپنا تو زندہ رہنا بھی ٹھہرا اک تقصیر

''عادل فقیر'' کے اس فرضی کردار میں عرش صدیقی ایک دنیا تج ہوئے صوفی کی طرح مسائل کا حل تو نہیں بتاتے البتہ ان کے ہاں ہر شے کو ٹھوکر مار کر جوگ کمانے یا فقیری کرنے کا تصور ابھرتا ہے، جو مشکل حالات میں صبر، شکر کے ساتھ جیون بسر کرنے کا پیغام دیتا ہے۔ اس مرحلے پر عرش صدیقی، کبیر داس کی طرح آگہی کے دریا کے کنارے پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں:

عادل کرسی آنی جانی ، دھوپ چھاؤں کا کھیل
بس اک کھاٹ فقیری والی ، اونچ نیچ کا میل

عادل چھوڑ سنگھاسن اپنا ، بیٹھ فقیر کے ساتھ
جو جیتا ہے دے کر سب کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ

تیرا فخر وہ عدل ترازو، جھوٹے جس کے باٹ
میرا فخر فقیری والی ٹوٹی ہوئی اک کھاٹ

حاکم اور محکوم سبھی کو ، ہے اس گھر کی تلاش
جس پر سایہ فگن ہو ، غم خواری کا آکاش

میرے پاس علاج ہے اس کا سنو فقیر کی بات
کالی کملی اوڑھ لو سارے ، کملی میں بارات

عرش صدیقی کے آخری دوہے میں جس ''کالی کملی'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ عالمین پر سایہ کناں ذات احمد مجتبیٰ ﷺ کی ہے۔ جو رحمۃ اللعالمیں ہونے کے ساتھ ساتھ عادل بھی ہے۔ یہاں ''کالی کملی'' والے کی کملی میں پناہ لینے کی بات ہے۔ عرش صدیقی کے دوہوں میں آں حضور ﷺ کا ذکر ایک مصلح اعظم کے ساتھ ساتھ ایک عادل اور عجز وانکساری کی حامل شخصیت کے طور پر ابھرتا ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں جن میں عرش صدیقی کی اس ذات سے والہانہ محبت اور عقیدت کا ثبوت ملتا ہے، چند دوہے پیش ہیں:

تیرا فخر عدالت والے بے حس رسم رواج
میرا فخر محمدؐ عادل ، پیر مرا حلاّج

یہ شاہی اس شخص کی شاہی جس کا بخت نصیر
جس کا احمدؐ نام ہوا ، جو عادل ، شاہ ، فقیر

عادل نام سوا احمدؐ کے ، دے نہ کسی کو زیب
بس اک اس کا عدل ہے سچا، باقی جھوٹ فریب

بن کرسی بھی اک حاکم نے عادل کیے کمال
احمدؐ اور محمدؐ ہے وہ ، اس کا عدل مثال

عادل تو بس ایک ہی دیکھا ، احمدؐ جس کا نام
نے فقیر کی سب سے پہلے ،آئے سب کے کام

ڈاکٹر عرش صدیقی اپنے دوہوں میں موضوعاتی تنوع کے حوالے سے کہتے ہیں کہ:

''لوگوں نے نعتیہ دوہے تک کہے ہیں۔اب تو ہائیکو میں بھی یہ تنوع آرہا ہے ان دونوں اصناف میں غزل کی سی وسعت آگئی ہے''

(روزنامہ پاکستان۔ ادبی صفحہ)

اردو دوہے میں موضوعاتی تنوع یا وسعت کی کوشش کرنے والے شعراء میں عرش صدیقی کا نام جمیل الدین عالی اور خواجہ دل محمد کے ساتھ آنا ضروری ہے کہ انھوں نے بھی دوہے کی پرانی بوتل کو نیا مشروب مہیا کرنے کے لیے بھرپور سعی کی ہے۔ میں نے عرش صدیقی کے دوہوں کو روایت سے ذرا ہٹ کر ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے خود پر تخلیقی وجدان کے ذریعے ہندی سرمائے سے استفادے کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ان کے ہاں تلسی داس ، کبیر داس بہاری اور رحیمن کے دوہے کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے جو انھیں ڈار سے بچھڑی کونج بننے سے بچاتا

ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں اس کلاسیکی سرمائے سے استفادے کی کئی صورتیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں عرش صدیقی کے دوہوں میں سے چند مثالیں ہی اس بات کے اثبات کے لیے کافی ہوں گی:

کیا کیا زریں تخت سجے اور کیا کیا پھیلے راج
اک شاہی ان سب سے اونچی، بن کرسی، بن تاج

ہم نے راہ فقیری والی گرچہ ہے اپنائی
من ٹکڑے ٹکڑے ہے کیوں، یہ بات سمجھ نہ آئی

ندیا کنارے چھوٹی سی بگیا، بگیا میں انگور
میں بگیا کے پاس کھڑا ہوں، بگیا مجھ سے دور

پنڈت، ملاّ کن آنکھوں سے کریں تری پہچان
اتریں جن آنکھوں بھگوان، ان کی اور ہی شان

عادل نچ نہ جان ہمیں گر ہاتھ کبھی پھیلائیں
مانگنا تو اک عادت ٹھہرا، ناں مانگیں مر جائیں

عرش صدیقی کے دوہے پڑھ کر ایک احساس ہوتا ہے اور وہ یہ کہ زندگی سے انھوں نے جو بھی نشاط وغم حاصل کیا اسے بڑی معصومیت اور ایمان داری کے ساتھ دوسروں کے سامنے دوہوں میں پیش کر دیا۔ ان دوہوں میں کسی بھی قسم کا تصنع یا بناوٹ نہیں ہے۔ ان میں سادگی، عجز، اور فقر کے رنگوں کے کئی چھینٹے بھی پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ جو عرش صدیقی کی شاعری کی جان ہے۔ ان دوہوں کو پڑھ کر عرش صدیقی کے ہاں ''فقر پر فخر کرنے کی روایت'' کا سراغ ملتا ہے۔ جو عام آدمی کے بس کا روگ نہیں۔

ڈاکٹر عرش صدیقی کی پنجابی شاعری

ڈاکٹر عرش صدیقی کی پنجابی نظموں کا مجموعہ ''کالی رات دے گھنگھرو'' جدید پنجابی نظم کی تاریخ میں ہمیشہ ایک اہم اثاثہ سمجھا جاتا رہے گا۔ پنجابی شاعری کے مزاج میں 'تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' والی بات کا اثر نہایت شدید ہے۔ اس لیے پنجابی کی کلاسیکی روایت میں جن شعراء کے نام آتے ہیں ان کا کلام عوام کے دلوں کے تاروں کو چھیڑ دیتا ہے۔ اس میں موجود گہرائی اور صوفیانہ فکر انسان کے عمومی مزاج کے بہت قریب ہے اس لیے اس پر الہامی کیفیت کا گمان ہوتا ہے۔ عرش صدیقی کی پنجابی نظمیں اس دور میں تخلیق ہوئیں جب ملک میں تیسرے مارشل لاء نے اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ اس لیے ان نظموں میں اس عہد کی ساری تاریکی اپنے پورے سیاق وسباق سے نظر آتی ہے۔ عرش صدیقی کی پنجابی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے افتخار شفیع لکھتے ہیں:

> ''جے ویہویں صدی دوجے ادھ اچ پنجابی نظماں نوں پڑھو تاں دوجے ادھ داچا نن سرگھا عرش صدیقی ہوریں منیجن گے۔ اوہناں اودوں لکھنا شروع کیتا جدوں اوہ وطن دی ہر شے سٹک (Stick) دے نال سدھی کیتی جاندی پئی ہئی۔ اوس زمانے دا سارا سوجھلا عرش ہوراں دیاں نظماں وچ صاف نظر آوندا اے''

(کالی رات دے گھنگھر بارے ویروا۔ ص 87)

پنجاب میں اردو کے کئی شعراء نے پنجابی زبان کو مادری زبان کے احترام کے طور پر اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ فیض کی آخری عمر کی پنجابی نظموں میں ہمیں ان کے ہاں پنجابی کی طرف جھکاؤ واضح

طور پر دکھائی دیتا ہے۔ کلیات مجید امجد میں مجید امجد کی ایک پنجابی نظم اس خوبصورت زبان سے ان کی دل سوزی کے رشتے کا ثبوت ہے۔ عرش مرحوم سے جب ایک انٹرویو میں یہ سوال کیا گیا کہ آپ نے اب آخری عمر میں پنجابی شاعری شروع کردی ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟۔ عرش صدیقی کا جواب کچھ اس طرح تھا:

''شاعری شروع نہیں کی کتاب چھپوائی ہے۔ میں بہت پہلے سے پنجابی لکھ رہا ہوں۔ میں نے دس گیارہ سال قبل پہلا پنجابی افسانہ لکھا تھا جو ایک رسالے میں شائع ہوا تھا''۔

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص 305)

عرش صدیقی کے پنجابی افسانے کی بازیافت کا کام تو کسی اور مرحلے پہ رکھ چھوڑتے ہیں۔ فی الحال ان کی پنجابی نظموں کا مطالعہ مقصود ہے۔ یہ نظمیں موضوع، اسلوب اور لفاظی کے اعتبار سے جدید ترین ہیں۔ نظم ''کالی رات دے گھنگھرو'' دیکھیں۔ شاعر نے کس طرح علامتی انداز میں سقوط ڈھاکہ سے چند ماہ پہلے کے منظرنامے کو اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے:

کالی رات دے کالے گھنگھرو
بکل گھنگھرو
وجن۔ سون نہ دین!
کالی شب دیاں کالیاں واجاں
انھیاں واجاں،
کناں تے اکھاں وچ چھن
چھن۔ سون نہ دین!
ادھی رات دا کالا سورج
اک پل نظر نہ آوے،

فیروی، انھیاں، کالیاں کندھاں توڑ کے میرے دل وچ اگ لگاوے!

شوکدی کالی اگ دا بھانبڑ

کالا بھانبڑ

رحم ذراناں کھاوے

کالے راگ سناوے!

مینوں نیندنہ آوے!

عرش صدیقی کی پنجابی شاعری میں محبت کا نظریہ کسی علاقے یا خطے تک محدود نہیں بلکہ اس کی حدود عالمی سطح تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ نسل انسانی نے قرنوں کے اس سفر میں جہاں بہت کچھ پایا ہے وہاں کچھ کھویا بھی ہے۔ کھو جانے والی قدروں کی دریافت کا عمل سست ہے اور دنیا آگے بڑھنے کے شور وغلغلے میں اپنے آپ سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ ''سگانِ دنیا'' کی یہ دنیاداری عرش صدیقی جیسے حساس ذہن کے حامل تخلیق کار کو اور بھی پریشان کر دیتی ہے۔ اس مرحلے پر عرش صدیقی اپنی ذات سے نکل کر معاشرے کی بقا کی فکری سطح پر لڑی جانے والی جنگ کے ہراول دستے میں شامل دکھائی دیتے ہیں۔ ایک نظم ''لمی رات دی سوچ'' میں ان کا انداز شاعری بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے:

میں دریا دے نال کھلوتا،

سوچاں،

سوچاں کنیاں ورھیاں وچ میں

کنے پینڈے مارے

کنی عمر اے اگے باقی

تے میں کنے سال وسارے!

میری سوچ دا انت کوئی ناں

کچھ انجام ناں ڈٹھے

سامھنے دریا، گجد اوجدا

ٹھاٹھاں مارے

اس نظم کا سال تخلیق 1979ء ہے۔ جب بات کو علامتی پیرائے میں کہنے کا ہنر درکار تھا۔ زخم کو پھول کہنے کی روایت کا آغاز ہو رہا تھا۔ اگلی نظم میں بھی یہی اسلوب دکھائی دیتا ہے۔ پوری نظم درج کی جاتی ہے:

وچلی گل

اجڑیا گھر ، تے اکھڑیا لپا

بوہے دی تھاں کالا کھپا

چلھا چپ تے اوٹا خالی

ویہڑے وچ ہوکے دی پالی

ساریاں کھونجاں اندر گھپن

ویلے دی پرواز دے چھٹن

اک پردیسی ، دکھاں جایا

کوئی نہ جانے کتھوں آیا

تے ساری وستی نوں پُچھے،

کتھے گئے اس گھر دے واسی؟

کون مینوں سینے نال لاسی؟

رووے کوئی تے کوئی ہسے

وچلی گل نہ کوئی دسے

(1975ء)

عرش صدیقی کی ایک پنجابی نظم ''اوہ نئیں ملیا'' کا مرکزی کردار ایک ایسا شخص ہے جو غم زمانہ کے ہاتھوں مجبور اور لاچار ہو کر بعض اوقات زندگی کی شاہراہ پر دوڑنے لگتا ہے لیکن جلد ہی ہانپنا بھی شروع کر دیتا ہے۔ اس میں ایک بے ساختہ قسم کا عشق بھی نارسائی کے احساس کے ساتھ اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے، اس نظم میں دیکھیں شاعر کسی آنے والے کو خوش آمدید کہنے کے لیے کس قدر بے قرار دکھائی دیتا ہے:

گھر دا بوہا کھلا چھڈ کے،
بگ ٹٹ ٹھیا ساں میں، تاں جے،
ادھی راہویں جا کے اوہنوں،
''جی آیاں نوں'' آکھاں!
ہتھ اپنا اوہدے ہتھ وچ دے کے،
اوہنوں اپنے نال لیاواں،
اوہدے ہوون دی خشبوتوں،
اپنے گھر دیاں کندھاں، اِٹاں، مٹی وچ وسانواں!

اس دیوانگی کی حد تک پہنچے ہوئے عشق اور محبت کی وارفتگی پر دوسری طرف سے جو ردعمل ہوتا ہے وہ بالکل عام سا ہے۔ یوں یہ سفر جو کسی کو خوش آمدید کہنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ رائیگانی کے ایک عجیب وغریب احساس میں بدل جاتا ہے:

تردیاں ٹردیاں ٹنگاں تھکیاں،
تے، بیتے سال تے سال،
اڈّھا رستہ مینوں لگا
پورے رستے توں دی لماں!
اُتر، دکھن، پچھم، پورب

اگے، پچھے، تجے، کھبے

ٹلے، ہمے، ٹوئے، کھوبے

ہر تھاں لبھیا،

چک چک اڈیاں

ہر تھاں لبھیا!

اوہ نہیں ملیا!

اس جگہ شاعر پر ایک انوکھی قسم کا راز منکشف ہوتا ہے۔ اور وہ اس بے کلی اور محرومی کے بعد ایک ایسا نتیجہ نکالتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ عرش صدیقی اس مرحلے پر ایک دانش منداور معاملہ فہم انسان دکھائی دیتے ہیں:

میں ان بکنی راہ چ کھلو کے سوچن لگا،

اوہ میرا مہمان۔ تے میں

دو بچے

دو سِدھے بچے،

بچیاں توں دی کچے بچے

خورے کیہڑیاں پٹھیاں راہواں تے ٹر پئے آں

ہاں دوہاں توں اک تاں ہے جو بخت دے

داور دے اندر،

راہواں دی پچھان گوا کے،

جتی بازی ہار گیا اے

جیتی بازی ہارنے والا یہ فریق شاعر کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاعر جانتا ہے کہ اس راستے کی ہار ہی میٹھی ہے۔ غم واندوہ کی اس ہلکی آنچ پر سلگنے والا دل ظرف کے اعتبار سے ایک

سمندر اور الجھنے والا دماغ، عقل کے اعتبار سے ایک بادل دکھائی دیتا ہے۔

عرش صدیقی کی ایک اور پنجابی نظم ''اپنے اندر جھاتی پا'' میں اقبال کی طرح من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی دعوت دی گئی ہے۔ نظم کا آغاز بہت پر شکوہ انداز میں ہوتا ہے۔ اس آغاز کے حصے میں کسی وجدانی سفر سے لوٹنے کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

ڈگدا مردا میں گھر آیا تے او بوہا جو میں کھلا
چھڈ کے گیا سی،
اک گیانی دے ہونٹھاں وانگوں بند پیا سی!
تے بوہے دا باہر لا کنڈا اجے پیا ہلدا سی

شاعر نے جب گیانی کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا تو اردگرد کی ہر شے، اسے آوازیں دینے لگ گئی، خوف اور ڈر کے اس ماحول وہ اپنے بستر تک پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ:

اوہ میرے بستر تے، اکھاں میٹ کے،
چٹی چادر اتے لئی، چپ چاپ پیا سی
تے اس چادر تے لکھیا سی
توں کملا ایں، جو تیرے اندر وسدا اے
اوہنوں توں کیوں گونگیاں گلیاں،
انھیاں سڑکاں، بھکیاں راہواں وچ لبھنا ایں
جے گیانی اپنا کرن داتوں رکھنا ایں سچا چا
میری گل نوں پلے بنھ،
تے اپنے اندر جھاتی پا

ڈاکٹر عرش صد یقی کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر عرش صدیقی اردو افسانہ نگاری کا معتبر حوالہ ہیں۔ان کے فن کی یہ جہت نسبتاً کم معروف ہے۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے شاعری اور تنقید میں ''خامہ جنگی'' کے بہت بعد افسانہ لکھنا شروع کیا۔ان کے اردو افسانوں کا مجموعہ ''باہر کفن سے پاؤں'' آدم جی ادبی ایوارڈ یافتہ ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے بھی ''عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے'' کے نام سے عرش صدیقی کا ایک افسانوی مجموعہ مرتب کیا۔کہا جاتا ہے کہ کوئی شاعر یا ادیب جب اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے تو اس کے افکار و نظریات اس کے اظہار کی اصناف میں سرایت کر جاتے ہیں۔عرش صدیقی کا پہلا اہم افسانہ ''کتے'' 1961ء میں ''نقوش'' میں شائع ہوا۔یہ افسانہ 1960ء میں تخلیق ہوا تھا۔اسی طرح دوسرا اہم افسانہ ''فرشتہ'' بھی اس کے کوئی دو سال بعد ''نقوش'' ہی میں چھپا۔عرش مرحوم کے افسانوی مجموعے ''کفن سے پاؤں'' میں ان کے دس افسانے شامل ہیں۔تعداد کے لحاظ سے یہ کوئی حوصلہ افزا صورت حال نہیں لیکن معیار کے لحاظ سے ان افسانوں کو اردو کے کسی بھی اہم افسانے سے موازنہ کرنے کے لیے پیش کیا جا سکتا ہے۔ عرش صدیقی افسانہ نگاروں کی کس کھیپ سے تعلق رکھتے ہیں اس کا اندازہ ڈاکٹر سلیم اختر کی اس تحریر سے باآسانی لگایا جا سکتا ہے:

''ملتان سے عرش صدیقی کے افسانوں کے آدم جی انعام یافتہ مجموعے ''باہر کفن سے پاؤں'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔اس کتاب کی جلد فروخت جہاں عرش

کے فن کی مقبولیت کی دلیل ہے وہاں اس امر کی مظہر بھی ہے کہ اچھے افسانوں کے لیے خوش ذوق قارئین کی کمی نہیں ہوتی"۔

(سالانہ ادبی جائزے .ص 24)

اس امر کا سراغ لگایا جانا ضروری ہے کہ آخر وہ کون سی وجہ ہے۔ جس کی بنا پر عرش صدیقی کے افسانوں کے مقبولیت ملی۔ بہ ظاہر تو اس کی ایک وجہ عرش صدیقی کے ہاں رومان کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقائق کا گہرا ادراک، سائنسی شعور کی روشنی میں دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں خود عرش صدیقی رقم طراز ہیں کہ:

"حقیقت کی زندگی میں بنیادی حیثیت ہے اور رومان زندگی کو قابل برداشت اور خوش گوار بناتا ہے اور مستقبل میں خود موجود نہ ہونے کے باوجود فرد کو اس سے منسلک کرتا ہے۔ ہر رومانی تحریر میں حقیقت کسی نہ کسی طور پر موجود ہوتی ہے لیکن رومان کو قبول عام بنانے کے لیے اسے حقیقت کے ساتھ ایک خاص تناسب سے ملانا ضروری ہے۔ میں رومان کو زندگی کے لیے لازم سمجھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ کوئی بھی ادبی تخلیق رومان سے یکسر خالی نہیں ہو سکتی لیکن ادیب اور شاعر کے محض محبت یا جنسی جذبوں کے سطحی اظہار تک محدود ہو جانے یا صرف آرزوؤں میں گم ہو جانے کو کسی طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ اردو میں ایسا بہت ہوا ہے۔ میں نے اپنی شاعری اور افسانہ نگاری میں ان تحریروں کو زیادہ اہمیت دی ہے بلکہ صرف انھی کو کچھ اہمیت دی ہے جہاں میں نے محسوس کیا ہے کہ میں اس سطح سے کچھ اوپر اٹھنے کے قابل ہو سکا ہوں"۔

(عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے . ص 9)

عرش صدیقی کی افسانہ نگاری کا یہی اسلوب انھیں دوسروں میں نمایاں کرتا ہے کہ فیض احمد فیض کی شاعری کی طرح انھوں نے رومانی اور انقلابی تصورات کو ایک خاص تناسب کے ساتھ باہم مربوط کر دیا ہے۔ وہ فطری طور پر رومان پسندی کی طرف راغب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے فنی

ارتقاء میں بھی رومانویت کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔ البتہ ایک شے ذرا قابل غور ہے، وہ یہ کہ عرش صدیقی کے ابتدائی افسانوں میں رومانویت زیادہ ہے جب کہ آخری افسانوں میں حقیقت کا تناسب قدرے زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر جو ایمرسن کالج ملتان میں عرش صدیقی کے رفیق کار رہے ہیں، ان کے افسانوں کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے گویا ہوتے ہیں:

''عرش صدیقی رومان سے حقیقت کی طرف آچکے ہیں۔ عرش صدیقی کے افسانوں میں غضب کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے طویل افسانوں میں تفصیلات سے تاثر کی ایک خاص فضا پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ باہر کفن سے پاؤں، آدم جی انعام یافتہ مجموعہ خوبصورت افسانوں کا حامل ہے''۔

(اردو ادب کی مختصر تاریخ۔ ص511)

عرش صدیقی کے افسانوں کے بہ نظر عمیق مطالعے کے بعد ہی اندازہ ہوتا ہے کہ افسانے کی دنیا میں ان کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدے، گہرے ادراک اور قدرتی فطانت کی بنیاد پر ایک پوری نسل کی تربیت کی۔ اگرچہ عرش صدیقی کی افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچان شاعر یا نقاد سے قدرے بعد میں بنی لیکن کہیں کہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بطور افسانہ نگار اگر تسلسل سے لکھتے تو انھیں ''شہرت اور بقائے دوام'' کے دربار میں ضرور جگہ مل جاتی۔ جابر علی سید ملتان کی تاریخ میں ایک نپی تلی رائے رکھنے والے بے رحم نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ اس بارے میں بجا طور پر لکھتے ہیں:

''شاعر کی نسبت وہ افسانہ نگار زیادہ بڑا ہے۔ گو اس نے ایک دو لافانی نظمیں تحریر کی ہیں۔ لیکن اس کے افسانے کی زبان خوبصورت ہوتی ہے۔ ''باہر کفن سے پاؤں'' کی فضا لاثانی ہے اور ''کتے'' کے موضوع کا ٹریٹمنٹ نہایت ہی منفرد ہے۔ ایسے افسانے اردو میں بہت کم ملتے ہیں''۔

(تنقید و تحقیق۔ ص122)

عرش صدیقی کو ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے یوں بھی بلند مقام حاصل ہے کہ موضوع،

تکنیک، ٹریٹمنٹ اور اسلوب کے لحاظ سے ان کا اسلوب نگارش ان کے ہم عصروں سے جداگانہ ہے۔ان کی شناخت میں عرش صاحب کی وسعتِ مطالعہ اور بلند تخیل کا بڑی حد تک عمل دخل ہے۔ روانی، حقیقت پسندی اور سلاست کے اعتبار سے انھیں سعادت حسن منٹو کا ہم پلّہ افسانہ نگار قرار دیا جاسکتا ہے۔عرش صدیقی کے افسانوں میں دور کے لحاظ سے ایک واضح فکری ارتقاء دکھائی دیتا ہے۔آج کا افسانہ علامتیت اور تجریدیت کے زیر اثر کہاں کا کہاں پہنچ گیا ہے۔کہانی پن کے افسانے میں سے غائب ہونے کی وجہ سے آج کے قاری کا رشتہ افسانے سے تقریباً ٹوٹ گیا ہے لیکن عرش صدیقی نے ہوا میں معلّق افسانے کی حقیقت کی طرف مراجعت میں اہم کردار ادا کیا ہے، ڈاکٹر طاہر تونسوی، عرش صدیقی مرحوم کے فن کے اس پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"آج بھی منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس اور اس قبیل کے دوسرے افسانہ نگاروں کی کہانیوں کے مجموعے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔عرش صدیقی اردو افسانے کی اس روایت کا حصہ ہیں اور عرش صدیقی ایسے ہی افسانہ نگاروں کے قبیلے کے فرد ہیں۔میرے خیال میں "ایک صحرا" "شہزادی" اور "اک جہاں" جیسے افسانوں کی طرح ان میں بھی یہی خصوصیت موجود ہے کہ انھیں ہر عہد میں پڑھا جاسکتا ہے اور ان سے لطف اندوز بھی ہوا جاسکتا ہے"۔

(عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے . ص 11)

یہ رائے بالکل درست دکھائی دیتی ہے، اب عرش صدیقی کے افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کی رائے دیکھیے:

"عرش صدیقی کے افسانوں کا بنیادی استعارہ چاہ بیاباں ہے اور اس کے متعدد روپ "باہر کفن سے پاؤں" کے افسانوں سے منعکس ہوتے ہیں۔معنوی اعتبار سے انھوں نے اپنی مٹی اور جڑوں سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔" ان کے افسانوں میں جبلت، جذبہ، لاشعور اور فکر ایک نا قابلِ تقسیم کُل میں موجود ہیں۔

''چوتھا مجوسی''، ''مور کے پاؤں'' اور ''ہم نشینی کا عذاب'' ان کے چند ممتاز افسانے ہیں''

(اردو ادب کی مختصر تاریخ۔ 564)

''باہر کفن سے پاؤں'' میں عرش مرحوم کے مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں:

1۔ باہر کفن سے پاؤں

2۔ مور کے پاؤں

3۔ تکمیل کا زخم

4۔ فرشتہ

5۔ کتے

6۔ ہم نشینی کا عذاب

7۔ بھیڑیں

8۔ ظلِ الٰہی

9۔ چوتھا مجوسی

ان افسانوں میں ''باہر کفن سے پاؤں'' ایک عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں عرش مرحوم کے زندگی کے تجربات کا نچوڑ دکھائی دیتا ہے۔ یہ تجربات دلچسپ بھی ہیں اور منفرد بھی۔ تارکین وطن کے مسائل کو موضوع بنانے والے اس افسانے میں حسنِ اسلوب کی ایک جھلک دیکھیں:

''۔۔۔ پھر میں وہاں سے بہت دور نکل گیا اور ایک اور براعظم میں پیدا ہوا۔ یہاں میں اب بھی زندہ ہوں ۔۔۔ یہاں میں کبھی نہ مروں گا ۔۔۔ یہاں میرے بچے ہیں اور پوتے پوتیاں ۔۔۔ یہاں میں زندہ رہوں گا ۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ''

(باہر کفن سے پاؤں)

یہاں آدم کے ارتقاء کے تجربے کو ایک ایسی منزل پر منتج کیا گیا ہے جہاں وہ حیات ابدی کی تفسیر بن جاتا ہے۔ اس افسانے میں جس مہارت کے ساتھ دو نسلوں کے مختلف رویوں کو موضوع

بنایا گیا ہے اس میں ان نسلوں کے اضطراب کو آسانی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔"باہر کفن سے پاؤں" میں کیا گیا تجربہ اس کہانی کی ظاہری سطح اور باطنی سطح دونوں پر واشگاف ہوتا ہے۔ ظاہری سطح پر موت اپنے بھرپور احساس اور جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔ مرنے والا شخص سب کچھ دیکھ اور سن سکتا ہے لیکن اس سے گویائی اور حرکت کرنے کی قوت چھن چکی ہوتی ہے وہ ہر بات ہر رویے پر احتجاج کرنا چاہتا ہے لیکن نہیں کر پاتا۔ اس افسانے میں گہری علامتیت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی کہتے ہیں کہ:

"اس کہانی کی دوسری یعنی علامتی سطح زیادہ معنی خیز ہے۔ بند کو توڑ کر باہر نکلے ہوئے پاؤں، زندگی کی حرارت کے حامل پاؤں، انسان کے زندہ رہنے کی تمنا کو ظاہر کرتے ہیں۔ پرانی قبروں میں نئے مردے دفنانے کے حوالے سے عرش نے ثقافتی ارتقاء کی نشان دہی کی ہے۔ قبر ایک ہی رہتی ہے، مردے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ عمل ہمارے معاشرے میں ایک مدت سے جاری وساری ہے"۔

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص 221)

عرش صدیقی مرحوم کا ایک افسانہ "مور کے پاؤں" بڑی خوبصورت بچوایشن کو جنم دیتا ہے۔ آج کے تغیر پسند عہد میں تبدیلی کے دلدادہ ایک ایسے انسان کو اس کہانی کا موضوع بنایا گیا ہے جسے مور کا رقص تو بے حد پسند ہے لیکن مور کے پاؤں اسے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ اسے اس بات کا علم نہیں ہے کہ مور کا یہ رقص بے خودی انھی پیروں کے مرہونِ منت ہے۔ اور پھر ایک مرحلے پر افسانے میں در او راک کھلتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ معاملہ ہی کچھ اور تھا:

"اس نے کہا تھا بارش کی شکایت کیوں کرتے ہو۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تم نے گڑھے میں گھر بنایا ہے اور پانی اردگرد کی اونچائی کا پانی، مٹی اور کوڑا کرکٹ لے کر اسی گڑھے ہی میں تو گرے گا"۔

(مور کے پاؤں)

آگے چل کے صورت حال اور دلچسپ ہو جاتی ہے:

"میرے پاؤں سخت بدنما ہو گئے تھے۔ بوجھل کالی چڑھائی ایک بھاری بدرنگ سانپ کی طرح میرے پاؤں سے لپٹی ہوئی تھی۔ میری ٹانگیں دبلی اور کمزور ہو گئی تھیں اور کالی چڑھائی کے بوجھ نے انھیں حرکت کی قوت سے محروم کر دیا تھا۔ میں واپسی کے سفر کے قابل نہیں رہا تھا"۔

(مور کے پاؤں)

اس افسانے کا بنیادی موضوع "تغیر پسندی" ہے لیکن اس تبدیلی یا تغیر سے مراد ایسا عمل نہیں جس سے معاشرے کی اعلیٰ اقدار کا قتل عام ہو۔ اس افسانے میں علامتی اظہار کے ساتھ ساتھ گہرا سماجی شعور بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

افسانہ "تکمیل کا زخم" انسانی رشتوں میں پیدا ہونے والی دراڑوں کی عکس کشی کرتا ہے۔ اس افسانے کی ہیروئن نیلم جب ایک حادثے میں اپنی خوبصورت نیلی آنکھوں سے محروم ہو جاتی ہے تو فیروز اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ مرد کے پاس عورت سے قطع تعلق کرنے کے سو بہانے ہوتے ہیں۔ سو اس صورت حال میں نیلم عجیب طرح کے کرب کا شکار ہے۔ ایک آنکھ کی کمی نے اس کے سارے چہرے کو بدنما بنا دیا ہے اور اب وہ اپنے باقی جسم سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ نیلم ایک حقیقت پسند عورت ہے۔ اس لیے جو زخم وہ کھا چکی ہے اس کا اعتراف کرنا بھی ضروری سمجھتی ہے۔ اس کا زخم اس وقت تکمیل پا سکتا ہے جب وہ کسی تصویر کی آنکھ پھوڑ ڈالے۔ اپنی اس ناآسودگی کا علاج اسے اسی عمل میں دکھائی دیتا ہے سو اس کا حل اس طرح نکلتا ہے:

"اس نے ایک برش اٹھایا اور اس کے دستے کی نوک کینوس پر اس زور سے ماری کہ برش کا سرا دوسری طرف نکل گیا۔ اب تصویر کے چہرے میں بائیں آنکھ کی جگہ ایک سیاہ سوراخ، ایک چھوٹا سا کالا دائرہ نظر آ رہا تھا اور خود مجھے بھی جو اس تصویر کا خالق تھا، تصویر کے چہرے سے خوف آنے لگا تھا"۔

(تکمیل کا زخم)

عرش صدیقی کا افسانہ "کتے" انسان کے ہاتھوں پامال ہونے والی انسانیت کو موضوع بناتا

ہے۔ اس افسانے کو اگر چہ پرانی تکنیک کے تحت لکھا گیا ہے لیکن یہاں بھی عرش صدیقی کی انفرادیت کام کر گئی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار پروین اپنی ماں کی تصویر کو دیکھتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس میں جان پڑ جائے لیکن یہ آرزو پوری نہیں ہو پاتی ان دیکھی ماں سے محبت کا یہ جذبہ باپ کی طرف منتقل ہوتا ہے تو باپ بھی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اب پروین کی دنیا کا مرکز اس کے باپ کے دیے ہوئے کھلونے ہیں۔ ان کھلونوں کے ذریعے وہ اپنے گردونواح کی دنیا میں عزت کے ساتھ جینا چاہتی ہے۔ پھر جب کھلونوں کے ساتھ کھیلنے کی عمر نہیں رہتی اپنے باپ کا مختلف جگہوں پر تذکرہ کر کے اسے سکینت ملتی ہے۔ بے جان کھلونوں کے درمیان زندگی گزارنے کی شائق پروین جب عملی زندگی میں متلاطم جذبات کے حامل لوگوں سے سامنا کرتی ہے تو اس کی نرگسیت آڑے آتی ہے۔ یہاں اس کی زندگی کا تضاد کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال کے مطابق:

> ''پروین۔۔۔ احساسِ تنہائی کی ڈسی ہوئی ہے۔ اس کا ماحول بے جان چیزوں میں زندگی ڈھونڈتا ہے۔ کتے بلیوں اور انسانی سیرت کے درمیان بعض رابطوں کی تلاش کرتے کرتے یہ گڑیا ڈر اور خوف کی دنیا میں اپنے آپ کو محصور کر لیتی ہے''۔

(اوراق۔ افسانہ نمبر۔ ص 312)

اس مرحلے پر پروین زندگی کے حقیقی کرداروں کا اپنے کھلونوں سے موازنہ کرتی رہتی ہے:

> ''اس کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ جو چیز یا بالخصوص جو شخص اسے پسند آ جاتا وہ اس کا مقابلہ اپنے بچپن کے کس کھلونے سے ضروری کرتی تھی''۔

(کتے)

> ''وہ محسوس کرتی تھی کہ ان بھائیوں میں سے ہی کوئی نہ کوئی، کبھی نہ کبھی اسے یوں دبوچ لے گا جیسے اس کی پسی نے اس کے طوطے کو لقمہ بنا لیا تھا''۔

(کتے)

''ہم نشینی کا عذاب'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو زندگی کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتا

ہے۔ وہ (صادق) ایک تخیل پسند کردار ہے۔ اس میں عمل کا فقدان ہے۔ وہ دروازے سے ڈرتا ہے اور کھڑکی پر دل وجان سے نچھاور ہے۔ کھڑکی اس کے نزدیک آزادی اور دروازہ قید اور حبس کی علامت ہے:

''فاصلوں کو میری روح سے ربط خاص ہے۔ فاصلے کم ہوتے ہیں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ قرب میں فنا ہے، وصل میں موت''

(ہم نشینی کا عذاب)

''میں ایک چھوٹی سی مچھلی ہوں اور یہ کمرہ میرا بحرِ اوقیانوس ہے''

(ہم نشینی کا عذاب)

''میں باہر کی دنیا کو صرف اس وقت دیکھ سکتا ہوں جب میں اپنے کمرے میں ہوتا ہوں''

(ہم نشینی کا عذاب)

عرش صدیقی ''نیچر'' کو پسند کرتے ہیں۔ فطرت کے حسین مناظر انہیں اپنی طرف راغب کرتے ہیں، ان کے خوب صورت افسانے ''اک جہاں سب سے الگ'' میں سے اس کی ایک مثال دیکھیں:

''سرسبز پہاڑوں اور دل کش وادیوں سے مجھے ہمیشہ پیار رہا ہے، یہاں کے درخت، ندی نالے، آبشار ہر شئے میری روح کا حصہ بن چکی ہے''۔

(اک جہاں سب سے الگ)

''سورج غروب ہونے میں بہت کم وقت باقی رہ گیا تھا مغربی افق پر شفق کی سرخی کا ہلکا ہلکا عکس نمودار ہو چکا تھا''۔

(اک جہاں سب سے الگ)

عرش صدیقی کے افسانے جس عہد کی تخلیق ہیں اس میں حقیقت پسندی ایک اہم عنصر کے طور پر شامل ہے لیکن عرش مرحوم نے اس میں رومان اور مٹھاس بھی بھر دی ہے۔ ان کے بعض جملے تو نثر کو

شاعری کے قریب کر دیتے ہیں چند مثالیں پیش ہیں:

1۔ ان پہاڑوں کو تو دیکھو جیسے دیوتا سو رہے ہوں۔

2۔ صبح ہوئی تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے دہکتے ہوئے کوئلے۔

3۔ وہی خوبصورت آنکھیں جیسے مرمر کی ڈبیا میں نیلم جڑے ہوں۔

4۔ فرائیڈ ولف کے ماہر ہاتھوں سے بنی ہوئی یہ تصویر جیسے منہ سے بول اٹھے گی۔

5۔ میرے ذہن میں موسیٰ پر نازل ہونے والے احکامات خداوندی میں سے ساتویں حکم کی عبارت گھوم رہی تھی۔

6۔ تم نے ٹینی سن کی نظم لیڈی آف شیلاٹ پڑھی ہے؟

7۔ میں پرومی تھیوس نہیں ہوں لیکن صبح کے عقاب کی تیز چونچ کو اپنے جگر میں پیوست محسوس کر سکتا ہوں۔

بلاشبہ عرش صدیقی ایک بہترین افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے اردو افسانے کی روایت میں بھرپور اور قابل قدر اضافہ کیا۔ ان کے افسانوں میں فنی اور فکری اعتبار سے اردو ادب کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے، یہی حقیقت ہے۔

ڈاکٹر عرش صدیقی کی تنقید

ایک نقاد کی حیثیت سے ڈاکٹر عرش صدیقی نظریات اور اصول وضوابط کے تحت کام کرنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اردو نقاد تھے جب کہ انگریزی زبان وادب کے استاد کے طور پر ان کا انگریزی اساطیر کا بھی گہرا مطالعہ تھا۔ علوم قدیم وجدید پر انھیں یکساں دسترس حاصل تھی۔ بلاشبہ انگریزی ادب میں مائیتھالوجی کے علاوہ ان کی فلسفہ، نفسیات اور سائنسی علوم پر مضبوط گرفت تھی۔ اس کے علاوہ پاکستانی زبانوں کے ادب پر بھی ان کی اچھی خاصی نظر تھی۔ اس ساری صورت حال میں ان کا تنقیدی شعور ایک خاص انداز سے نکھر کر سامنے آیا، ڈاکٹر عرش صدیقی نے مختلف شعراء کی نظموں کے تجزیات کرنے سے اپنے تنقیدی سفر کی ابتدا کی۔ ان کے دو تنقیدی مجموعے ''تکوین'' اور ''محاکمات'' کے نام سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آئے۔ ڈاکٹر عرش صدیقی کی تنقید کا دائرہ کار شاعری، افسانہ نگاری، تنقید اور سائنس تک پھیلا ہوا ہے۔ بقول پروفیسر شوذب کاظمی:

''تکوین، ڈاکٹر عرش صدیقی کے ان تنقیدی مقالات پر مشتمل ہے۔ جو نظریاتی اور اصولی مباحث پر لکھے گئے ہیں۔ جب کہ محاکمات، میں اردو شاعری، افسانے اور تنقید کے حوالے سے ادیبوں کی نگارشات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یعنی تکوین کی صورت میں عرش صدیقی کا تنقید نگاری سے متعلق وہ مؤقف سامنے آتا ہے جس کے زیر اثر انھوں نے بطور نقاد ایک خاص طرز فکر اختیار کیا۔ اور محکمات، میں اس طرز فکر کی اطلاقی شکل مختلف تخلیقات کے تجزیاتی

مطالعوں میں دکھائی دیتی ہے"۔

(دنیائے ادب کا عرش۔ ص 269)

ڈاکٹر عرش صدیقی نے بطور نقاد مختلف موضوعات جن میں بعض علوم جدیدہ بھی شامل ہیں اردو قارئین سے متعارف کروانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے بعض قدیم اشیاء کی جدید سائنسی تعلیم کی روشنی میں تعبیر و توجیہ پیش کرنے کی بھرپور سعی کی۔ ان کا سائنسی شعور اردو کے دیگر ناقدین کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس کی مثال دیتے ہوئے ایک واقعہ پیش کرتے ہیں:

"ڈاکٹر عرش صدیقی کا طویل مقالہ "شعور، سائنسی شعور اور ہم" علامہ نیاز فتح پوری یادگاری لیکچر 1990ء کے طور پر کراچی کے ایک علمی وادبی اجتماع میں پڑھا گیا۔ اس اجتماع میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، پروفیسر ممتاز حسین اور شعبہ فلسفہ جامعہ کراچی کے صدر ڈاکٹر منظور احمد جیسے سائنٹیفک سوچ رکھنے والے دانش وروں کے ساتھ ساتھ نئی نسل اور میری عمر تک کے تقریباً سارے قابلِ ذکر اہلِ قلم موجود تھے۔ سب نے اس طویل مقالے کو نہایت سنجیدگی و دلچسپی کے ساتھ سُنا۔ مقالے کو ہر گوشے سے کھلے دل سے سراہا گیا اور اسے جدید اردو نثر کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا قرار دیا گیا اور عرصہ تک علمی وادبی حلقوں میں اس کا تذکرہ رہا"۔

(شعور اور سائنسی شعور کا ادیب۔ ص 284)

عرش صدیقی کی سائنسی تنقید میں سطحی قسم کی بحث سے اجتناب کرتے ہوئے استدلال اور منطق کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کی کوشش کا سراغ ملتا ہے۔ ویسے ایک سائنسی طرز کا زاویہ نظر تو ان کے افسانوں اور شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم ان کے شعری یا افسانوی مجموعوں پر نظرِ ڈالیں تو اپنے سائنسی پہلو کو متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ جب اپنے افکار کی تبلیغ کرتے ہیں تو بعض اوقات مشاہیر کی علمیت پر طنزیہ چوٹ لگانے

سے بھی بعض نہیں آتے:

"شاعری یا فن کی کسی ایک فارم کو یا ثقافت کی کسی ایک صورت کو نسخہء کیمیا کا درجہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا ہمارے ہاں آزاد نظم اور سائنس کا جس طرح راستہ روکا گیا وہ ایک غیر سائنسی رویہ تھا اور غیر انسانی بھی۔

"مولوی عبدالحق جیسے جید عالم نے بھی اپنی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری میں مائتھالوجی کا ترجمہ خرافات کیا جبکہ دنیا کی تمام اہم لغات مائتھالوجی کو علم اور سائنس قرار دیتی ہیں۔ اور اسے انسانی فطرت اور کائنات کی پہچان کی ابتدائی اور بامعنی کوشش کے طور پر قبول کرتی ہیں"۔

(تکوین۔ ص 87)

عرش صدیقی نے شعوری طور پر تنقید کو تاثراتی یا مجلسی تنقید سے ایک درجہ آگے کرتے ہوئے شعور سے وابستہ کرنے کی سعی کی۔ اس سلسلے میں ابتدائی طور پر ان کے فیض کی شاعری کے حوالے سے لکھے گئے مضمون "فیض کی شاعری میں رومانوی عناصر" نے ملکی سطح پر ان کی پہچان قائم کر دی۔ ایک جگہ پر جب عرش صدیقی قبول دعا اور ٹیلی پیتھی کے عمل کی سائنسی حوالوں سے توجیہ پیش کرتے ہیں تو لوگ چونک اٹھتے ہیں۔ "شعور، سائنس شعور اور ہم" تنقیدی لحاظ سے عرش مرحوم کا نمائندہ مضمون ہے۔ اساطیر یا مائتھالوجی بھی ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ "اسطورہ" کا لفظ ان کے لیے ابتدائی سائنس کا دوسرا نام ہے۔ ڈاکٹر عرش صدیقی نے واضح طور پر اپنے نظریات میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر خواجہ زکریا، آرزو چودھری اور ڈاکٹر مہر عبدالحق کے افکار کے اثر و نفوذ کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے مقالے "اردو اور اساطیر عالم" میں وہ ایک حکیمانہ اضطراب کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ یہ مضمون دراصل ڈاکٹر مہر عبدالحق کی تحقیق ہندو صنمیات کے موضوع پر لکھی گئی کتاب مقدمے کی صورت میں سامنے آیا۔ اس مضمون میں عرش صاحب نے عالمی اساطیر کے تصورات کی روشنی میں اشہب قلم کو دوڑایا ہے۔ دنیا کے زندہ رہ جانے والے تمدنی

نقوش کی مدد سے انھوں نے مختلف قدیم معاشروں میں رائج معلومات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس سلسلے میں عرش مرحوم کی جاپانی، عراقی، چینی، ہندوستانی اور ایرانی اساطیر کی گہری نظر کی داد دینا پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''جن زبانوں نے زیادہ ترقی کی ہے اور یوں ان کے قدیم ادب وتہذیب اور معاشرت کا سرمایہ دوسرے ملکوں تک پہنچا ہے۔ ان میں سے ہر ملک کی مائتھالوجی کے مطالعہ نے ہمیں تمام ملکوں کی قدیم تہذیبوں اور داستانوں میں خوشگوار اور حیرت انگیز مشابہتیں ملتی ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ملتی ہے کہ ان میں سے بیش تر میں آغاز کے وقت خدائے واحد کا تصور واضح طور پر موجود تھا۔ بعض جگہوں پر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دیوی دیوتاؤں کی حیثیت ان مخفی قوتوں کی سی ہے جنھیں ''خدا'' نے کائنات میں بعض مخصوص ذمہ داریاں سونپ رکھی ہیں''۔

(تکوین۔ ص 31)

عرش صدیقی کے تنقیدی سرمائے میں ایک مقالہ ''میرا نظریہ شعر و ادب'' بھی موجود ہے۔ یہ بظاہر تو عرش مرحوم کے شعری نصب العین پر روشنی ڈالتا ہے لیکن ہر تخلیق کار کے لیے سوچنے اور غور کرنے کے در وا کرتا ہے۔ آغاز میں لکھتے ہیں:

''مجھے یہ خوش فہمی (غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے) کہ میری بیش تر نظمیں ہمارے دوسرے شعراء کی نظموں سے مختلف ہیں اور ان نظموں کا لہجہ، اسلوب کا مجموعی تاثر، ان میں منعکس انسانی رویہ اور ایک حد تک موضوعات کا انتخاب مجھے دوسرے شعرا سے ممتاز نہیں تو انفرادی پہچان کے لیے لازمی حد تک مختلف اور الگ ضرور کر دیتا ہے''۔

(تکوین۔ ص 7)

عرش صدیقی اپنی تنقیدی رائے میں سچے عشق کو اندھا جذبہ تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح ان کے نزدیک فن بھی لاشعور سے بندھے کسی اندھے جذبے یا ظالم جبلّت کا نام نہیں۔ شعر کہنا ان کے

لیے کسی حد تک مجبوری ہو سکتا ہے۔فن ان کے لیے شوق فضول بھی نہیں اوران کی ضرورت بھی ہرگز نہیں ۔عرش صدیقی فن کو جذباتی انداز میں دل کی آنکھ سے نہیں دیکھتے بلکہ اپنے نظریے کی وضاحت کے لیے وہ رقم طراز ہوتے ہیں:

''میرے تمام رویوں کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ آج کا باہوش فنکار اور انسان جذبوں اور جبلتوں کا اسیر محض نہیں ہے۔میں زندگی کے ہر شعبے میں عموماً اور ادب و فن میں خصوصاً شعور کی برتری کو تسلیم کرتا ہوں۔ میں جذبوں اور جبلتوں کو مسترد نہیں کرتا۔ میں بسا اوقات انسان کے فطرت کی قوتوں کے سامنے بے بس ہو جانے کے امکانات سے انکار نہیں کرتا۔لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ فطرت نے جس حد تک انسان اور فن کار کو سوچنے سمجھنے، خود کے بے خبری اور بے بسی کی دلدل سے نکالنے کی قوت دی ہے۔اس حد تک اس کا استعمال بھی ضرور کیا جائے''۔

(تکوین . ص 10)

عرش صدیقی کے نزدیک تخلیقی عمل اپنی مبادیات اور اصولی مباحث کے ساتھ اہمیت کا حامل ہے۔اس اصطلاح یعنی ''تخلیقی عمل'' پر بحث کرتے ہوئے اکثر یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ آخر تخلیقی عمل کیا ہے؟ انسانی ذہن میں افکار و اعیان کہاں سے اور کیوں کر آتے ہیں؟ اور آخر کیا وجہ ہے کہ جس کے سبب وہ ایک تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

عرش صدیقی نے بڑی باریک بینی کے ساتھ اس موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے یہ بھی بحث کی ہے کہ کیا تخلیقی عمل اپنے اردگرد سے بے نیاز ہے اور کیا صرف انسانی ذہن کو فن یا ہر اس شے جسے ہم ذہنی تخلیق کا نام دے سکتے ہیں۔خود کار منبع و مخرج قرار دیا جا سکتا ہے؟ ان مذکورہ بالا سوالات کو عرش مرحوم نے ازمنہ قدیم کے انسانی رہن سہن اور بود و باش سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔کہتے ہیں:

''ازمنہ قدیم سے ہی انسان یہ سمجھتا رہا ہے کہ دوسری چیزوں کی طرح تخلیق فن

بھی ایک عطیہ خداوندی ہے۔ یوں تخلیقی عمل کو انسانی سطح پر سمجھنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جب شعر کو الہام سمجھا جائے اور شاعری جزو ایست از پیغمبری کو اپنے لفظی معانی میں ہی قبول کر لیا جائے تو گویا انسان خود ہی شکست ادراک و فہم تسلیم کر لیتا ہے"۔

(تکوین ۔ ص 185)

عرش مرحوم کے نزدیک تخلیقی عمل دراصل ایک ردعمل ہے۔ ظاہر ہے تخلیق کا ردعمل بھی تخلیق ہی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ تخلیق عمل میں شعور لاشعور کا حصہ مساوی ہے۔ ہائیکو یا ہائیک جاپانی صنف سخن ہے۔ تین مصرعوں کی اس مختصر نظم کا اردو ادب میں پودا لگانے والے شاعر ڈاکٹر محمد امین ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت اور تسلسل کے ساتھ اس صنف کی مقبولیت کے لیے تگ و دو کی۔ اپنے مضمون "ہائیکو اور ڈاکٹر امین" میں عرش صدیقی مختلف ملکی اور غیر ملکی اصناف سخن کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے ہائیکو کو اردو ادب میں اہم اضافہ قرار دیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بحث میں جواز فراہم کرتے ہیں کہ متعدد وجوہات کی بنا پر اس صنف کے ثلاثی یا رباعی کی نسبت اردو میں فروغ کے زیادہ امکانات ہیں۔ ڈاکٹر عرش صدیقی نے ہائیکو کے اوزان کے حوالے سے چھیڑی گئی بحثوں پر اظہار خیال کرنے کے بعد رائے دی کہ ابتدائی طور پر ڈاکٹر محمد امین کا نقطۂ نظر ہی موزوں ہے۔ ہائیکو کو ملنے والی مقبولیت کے پیش نظر عرش صدیقی کہتے ہیں:

"ہائیکو کو مقبول اور رائج ہونے میں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہائیکو کی تخلیق میں بعض آسانیوں کا اس کی مقبولیت کی بنیاد بن جانا سمجھ میں آتا ہے۔"

(تکوین ۔ ص 257)

عرش مرحوم چونکہ پیشے کے اعتبار سے انگریزی ادب کے استاد تھے۔ اس لئے انگریزی زبان ان کے نزدیک ایک ایسی کھڑکی کی طرح ہے جس کے ذریعے سے مغرب کے افکار جدید کی ٹھنڈی ہوا ہمارے حبس میں دڑاڑیں ڈالتی ہے۔ "اردو کے لئے انگریزی کی ضرورت" کے عنوان

سے لکھے گئے مضمون میں عرش مرحوم نے نہ صرف انگریزی کی سیادت کو تسلیم کیا ہے بلکہ انگریزی اور اردو کو مزاج اور لسانی خاندان کے لحاظ سے باہم مماثلت رکھنے والی زبانیں قرار دیا ہے۔ عرش مرحوم کا خیال ہے کہ اردو کو بعض امور میں انگریزی سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے وہ کسی حد تک اس کے اثرات قبول بھی کر رہی ہے۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

''اردو زبان بار بار ہونے والے اعتراضات کے باوجود انگریزی زبان سے برابر اثر لے رہی ہے۔ ادھر انگریزی زبان گذشتہ ایک ہزار سے زیادہ برس سے مسلسل اپنے ذخیرہ الفاظ میں خوش دلی کے ساتھ دوسری زبانوں کے زیر اثر اضافہ کئے چلی جا رہی ہے اور اس سلسلہ میں اس نے برصغیر کی زبانوں سمیت دنیا کی کسی بھی زبان پر اپنے دروازے بند نہیں کئے۔ اردو زبان کے مزاج میں، اس کی ساخت اور اس کی بنیاد میں وہ توانائی اور انجذاب کی وہ قوت موجود ہے جو انگریزی زبان سے ایک ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے خاص چلی آ رہی ہے۔''

(تکوین۔ ص 261)

''اردو افسانہ ترجیحات اور صورت حال'' دراصل ڈاکٹر عرش صدیقی اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کے درمیان ہونے والا ایک علمی مکالمہ ہے۔ اس میں مکالمے کے باوجود گہرا تنقیدی ادراک موجود ہے۔ درحقیقت یہ مکالمہ عرش صدیقی کے سات مسترد افسانوں کی اشاعت کے حوالے سے اٹھنے والے سوالات کے تسلی بخش جواب کے لئے کیا گیا ہے۔ اس مکالمے کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

''عرش صاحب! میں آپ سے آپ کے ان افسانوں کی کتابی صورت میں اشاعت کی اجازت لینے آیا ہوں جنہیں آپ نے اپنے مجموعے ''باہر کفن سے پاؤں'' میں شامل نہیں کیا تھا۔''

اوران کے جواب میں عرش صدیقی کہتے ہیں:

''آپ نے مجھ سے اجازت مانگی ہے۔ میں اسے آپ کی مہربانی سمجھتا ہوں۔ ورنہ ہمارے ہاں اتنا بھی لوگ کم ہی سمجھتے ہیں۔ کراچی کے ایک ڈائجسٹ، چودھویں صدی، نے میری ایک تالیف ''امیر علی کی سرگذشت'' کو قسطوں میں شائع کر لیا اور پھر اس کے بارے میں یہ بھی لکھا کہ قارئین نے اسے بہت پسند کیا۔ لیکن رسالے کے مدیر، ہمارے مقبول و کامیاب کمپیئر اور فنکار طارق عزیز صاحب نے مجھ سے اجازت لی اور نہ رسالہ کا کوئی نسخہ بھیجنے کی تکلیف گوارا کی۔ شاید طارق عزیز سمجھے ہوں گے کہ پرانا سا نام لگتا ہے کوئی پچھلی صدی کا آدمی ہوگا۔ مر کھپ گیا ہوگا۔ یہ خطرہ بھی ضرور ہوگا کہ اجازت طلب کی تو معاوضہ نہ مانگ لیا جائے۔''

عرش صدیقی نے اپنے تنقیدی مجموعے ''تکوین'' ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کے نام معنون کیا ہے۔ اپنے دوسرے تنقیدی مقالات کے مجموعے ''محاکمات'' میں انہوں نے شاعری، افسانہ اور تنقید سے متعلق نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ اپنے ایک اہم مضمون ''عارف عبدالمتین کی نعتیہ شاعری'' میں وہ لکھتے ہیں۔

''برتر دانش رکھنے والے افراد جب تک عقیدے کو عملی اور شعوری طور پر بھی آزما نہ لیں صداقت اور ابدی حسن کی تلاش کے لئے اپنی کوششوں کو نامکمل محسوس کرتے اور بے چین رہتے ہیں۔ انسانی دانش شعور اور اقدار کی مکمل ترین صورت تعلیمات اسلام میں اور ان کا مکمل ترین عملی ظہور حضور ﷺ کی زندگی میں ہوا۔''

(محاکمات۔ ص 37)

ایک اور مضمون میں جو ''شام اور سائے'' کے تناظر میں ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری کے حوالے سے لکھا گیا ہے، عرش صدیقی نے واضح کیا ہے کہ وہ (وزیر آغا) مذہبی یا ترقی پسند شاعر نہیں۔ بلکہ ان کی شاعری میں ارضی حوالوں کے ساتھ ساتھ فلسفہ، اخلاقیات اور معاشریات کے اصول بھی

جھلکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کو جمالیاتی حوالے سے جانچنے کی ضرورت بھی ہے۔ ایک اور مضمون میں جواں مرگ شاعر انوار انجم کی شاعری جائزہ لیتے ہوئے وہ انوار کی شاعری کو اسیرِ تنہائی کی نوائے پر درد قرار دیتے ہیں۔ ایک اور مضمون ''شاعری اور فیاض تحسین کی شاعری'' میں اردو شاعری کے روایت کے تناظر میں اپنے ہم دم دیرینہ کے فن کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر سلیم اختر، میرزا ادیب اور لطیف کاشمیری کے فن کا بھرپور تبصرہ بھی عرش صدیقی کے تنقیدی سرمائے کی جان ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف ۔اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تنقید پر بحث کرتے ہوئے ان دونوں نقادوں کے معروضی انداز میں غیر جانب داری سے کام لینے والے نقاد قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر عرش صدیقی کا تنقیدی مواد اگرچہ ان کی اپنی پسند کی اصناف سخن کو ہی موضوع بناتا ہے لیکن اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ وہ نوجوان نسل کی حوصلہ افزائی کرنے کے حوالے سے بڑی نیک نامی رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نئی نسل کے شعرا کے اولین شعری مجموعوں کے دیباچے بھی تحریر کیے ہیں جو ان کے علم پروری کی دلالت کرتے ہیں۔

ناقدین کی آراء

''آج سے چند روز پہلے جب مجھے عرش صدیقی کی نظموں کا مجموعہ ''محبت لفظ تھا میرا'' موصول ہوا اور میں نے اس کی ورق گردانی کی تو مجھے معاً اس احساس نے گرفت میں لے لیا کہ اس مجموعے میں کسی بہت پرانی بات یا واقعہ کی ایک نئی شاعرانہ توجیہہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے مجھے کارل مارکس کا وہ دعویٰ یاد آ گیا کہ ہیگل کا نظریہ جدلیات سر کے بل کھڑا تھا مگر میں نے اسے پاؤں کے بل کر دیا ہے۔ یہ بات کہ کیا واقعتاً ہیگل کا نظریہ سر کے بل کھڑا تھا اور کیا واقعی مارکس نے اس کے بل نکال لیے یا اس میں مزید بل ڈال دیے یہ فی الحال متنازعہ فیہ ہے۔ البتہ عرش صدیقی کے معاملے میں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جب اس نے قدیم داستانوں کے بنیادی اور مرکزی تصور یا Motif کی باز آفرینی کی تو ایک نئی شعری صورتِ واقعہ وجود میں آ گئی۔''

(ڈاکٹر وزیر آغا)

''عرش صدیقی کا پہلا مجموعہ کلام ''دیدۂ یعقوب'' تھا۔ اس مجموعہ نے منظر عام پر آتے ہی اہل بصیرت ہی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا کیونکہ اس مجموعے کے شاعر نے عام حقیقتوں کے انبار میں کچھ ایسے حقائق بھی تلاش کر لیے ہیں جو عام نگاہوں کو دکھائی نہیں دیتے اور یہ دوسرا مجموعہ تو ان کی بالغ نظری کا شاہکار ہے۔ لگتا ہے دیدۂ یعقوب کی نظر ایک لمبا چوڑا سفر طے کرنے کے بعد کنعانِ حقیقت کے یوسف تک پہنچی ہے۔''

(میرزا ادیب)

عرش کرداروں اور فضا کو ہم آہنگ کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ قصے کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ملاتے ہیں۔ واقعات کا پہاڑ، معاشرتی اوضاع کے تناظر میں مختلف اجزا کو باہم مربوط کرتا ہے۔ یہ ربط کبھی تو Flash Back کی صورت میں اور کبھی کہانی کے بیانیہ انداز میں ابھرتا ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور کرداروں کے داخلی رد عمل کو ساتھ ساتھ چلا کر عرش ہمیں بار بار منٹو کی یاد دلاتے ہیں۔ یہی خوبی اسلوب کی پیروی میں عرش کے لئے کبھی کبھی خامی بن بھی جاتی ہے۔ عرش منٹو کو اپنی کمزوری نہ بنائیں اور ان کے اسلوب کی شعوری پیروی کی کوشش نہ کریں تو ان سے مستقبل میں عظیم کہانیوں کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے۔ ''فرشتہ'' جس افق کی طرف اشارہ کرتی ہے اس سے عرش کا فنی مستقبل بہت روشن اور تابناک نظر آتا ہے۔''

(ڈاکٹر وحید قریشی)

''عرش صدیقی جب اردگرد کی دنیا کو دیکھتا ہے، اس میں پھیلی گندگی کو دیکھتا ہے اور اس گندگی میں کیڑے مکوڑوں کی طرح کلبلاتے انسانوں کو دیکھتا ہے تو وہ ان کی تصویر کشی کے لئے ویسے ہی رنگ استعمال کرتا ہے جو ان کی درست تصویر کشی کے لئے ضروری ہیں۔ اسے نہ تو دنیا کی بدصورتی دور کرنے کا شوق ہے نہ وہ رندا لے کر معاشرے کی چولیں درست کرتا ہے۔ نہ اس نے اخلاقیات کے ایسے فرمے بنا رکھے ہیں جن پر وہ انسانوں کی ٹوپیوں کی طرح فٹ کرتا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ گندگی کو خوشبو میں تبدیل کرنے کا خواہاں بھی نہیں لیکن ایک بات ہے کہ منٹو کی مانند وہ خوشبو میں گندگی بھی نہیں دیکھتا۔''

(ڈاکٹر سلیم اختر)

''عرش صدیقی ہمارے ان ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں جن کی تحریریں ٹھہر کر اور سمجھ کر پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ ہم سرسری طور پر ان سے نہیں گزر سکتے۔ وہ خود ادبی مسائل پر سوچتے ہیں اور دوسروں کو سوچنے پر مائل کرتے ہیں۔ یہ بات ہمارے لکھنے والوں میں خال خال پائی جاتی ہے۔ عرش صدیقی نے جس طرح نفس شاعری، شاعری کے تقاضوں، عصری آگہی، شاعر کی ذمہ

داریوں، لفظ، معنی اور ہیئت کے رشتوں سے بحث کی ہے وہ خود اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم چھوٹے پیمانے پر A Preface to Lyrical Ballands پڑھ رہے ہیں۔"

(مجتبیٰ حسین)

عرش صدیقی کا ریاض فن تخلیق و تنقید کے تین اہم مراحل سے گزر کر تکمیل کو پہنچا ہے وہ اولاً ایک جدید شاعر کے روپ میں سامنے آئے اور انھوں نے زندگی کو ایک نیم روشن پہاڑی سے دیکھ کر وہ سحر انگیز کیفیت پیدا کی جسے صرف ایک باشعور اور خردمند جدید انسان ہی پیدا کر سکتا ہے۔ تخلیق سے تنقید کی طرف مراجعت عرش صدیقی کی فنی جست نہیں بلکہ یہ ان کی فکری ضرورت نظر آتی ہے اگر وہ تخلیق مکرر کی کوشش کرتے اور صرف اپنے پر ہی نظر ڈالتے تو میں سمجھتا کہ عرش صدیقی اب اپنی مدافعت کر رہے ہیں اور کم نظر نقاد کو اپنی جانب متوجہ نہ پا کر خود یہ فریضہ انجام دینے کی سوچ رہے ہیں۔ اس کے برعکس تنقید میں عرش صدیقی کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے بالعموم فن کی نظریاتی بحث کو فوقیت دی۔ ادب کے جدید نظریات تراشے اور عملی تنقید میں ان نظریات کی روشنی میں معاصر ادب پرکھنے کی سعی کی ہے۔

(ڈاکٹر انور سدید)

عرش صدیقی نے شعور سائنسی شعور پر محض نظری بحث ہی کو سب کچھ نہیں جانا بلکہ اس زاویہ نظر کو استدلال و امثال کے ساتھ اپنی تحریر میں اس طرح سمو لیا ہے کہ ان کا مقالہ سائنٹیفک تحریر کا قابلِ توجہ نمونہ بن گیا ہے۔ سائنٹیفک تجزیہ و تحلیل کا یہ سلیقہ جو ان کے زیر بحث مقالے میں ملتا ہے، عرش صدیقی کی ساری تحریروں میں شروع سے نظر آتا ہے۔ ان کے شاعری کے مجموعوں "دیدہ یعقوب" اور "محبت لفظ تھا میرا" پر نگاہ ڈالیے یا ان کے منتخب و مسترد افسانوں کا مطالعہ کیجیے یا ان کی ان تنقیدی تحریروں کا جائزہ لیجیے جو بیشتر "اوراق" میں شائع ہوئی ہیں سب کی سب ایک تامل پسند طبیعت، ایک تفکر آمیز تحلیل، ایک خیال انگیز احساس اور ایک باشعور ذہن کی زائیدہ و تربیت

یافتہ نظر آئیں گی"۔

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

شاعر کے بارے میں ڈاکٹر عرش صدیقی کا نقطۂ نظر جامد نہیں بلکہ وہ شاعری کے فطری ارتقاء پر یقین رکھتے ہیں۔اس لیے ان کی نظر امکانات سے ایک لمحہ کے لیے بھی ہٹنے نہیں پاتی"۔

(ڈاکٹر توصیف تبسم)

عرش صدیقی کی شاعری میں عنصرِ رجائیت کا فقدان ہے۔لیکن یہ کوئی عیب نہیں کیوں کہ شوپن ہار کے خیال میں رجائیت ایک حماقت ہے، مجھے شوپن ہار سے اتفاق نہیں ہے۔تاہم کسی فن کار کو جو طبعاً رجائی نہ ہو محض ستائش خلق کے لیے رجائیت پسندی کا بے جا مظاہرہ نہ کرنا چاہیے، کیوں کہ اس مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی ہے۔اسی طرح محض تقلیدی طور پر یاس وحزنیت کے اظہار سے بھی لغویت ظاہر ہوتی ہے، عرش کو غمِ حیات اور کشاکشِ ہستی سے زیادہ سابقہ پڑا ہے وہ غم کو "برائے شعر گفتن خوب است" کے مصداق بنا کر ظاہر نہیں کرتے بلکہ یہ ان کے لیے ذاتی اور شخصی واردات کی حیثیت رکھتا ہے"۔

(وزیری پانی پتی)

عرش صدیقی کے مزاج میں عفو و درگزر کا جو درخشاں عنصر بہ درجہ اتم پایا جاتا ہے اس نے انھیں ان صدمات سے جلد ہی رہائی دلا دی جو بصورت دیگر ان کی شخصیت کو اضمحلال کا نخچیر بھی بنا سکتے تھے۔لہٰذا وہ ملتان کی فضاؤں میں اپنے مخلص احباب کی معیت میں محبت، اخوت، علم وادب اور تہذیب وثقافت کے رنگ بکھیرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔اردو کے بارے میں ان کا رویہ ایسا ہے جس سے اردو ہی نہیں پنجابی اور سرائیکی کی محبت کے چشمے بھی ابلتے ہیں"۔

(عارف عبد المتین)

عرش صدیقی ہر دور میں پورے اعتماد اور تیقن کے ساتھ لفظ کا ضمیر بن جاتے ہیں۔ان کا یہ پندار ان کی استقامت کا ثبوت ہی فراہم نہیں کرتا دوسروں کو عبرت کا درس بھی دیتا ہے۔ان کے

دوستوں نے ان سے بہت سے لفظوں کی نئی معنویت پائی ہے۔ مصلحت کے لفظ کو ہم ہمیشہ منفی معنوں میں لیتے ہیں۔ انھوں نے اسے اثباتی مفہوم بخشا بالکل اسی طرح جسے ہمارے سب سے بڑے قومی شاعر نے خودی کی منفیت کو اثبات میں بدل دیا۔ اسی طرح لفظ محبت کے ساتھ جو روگی رومانویت وابستہ ہو چکی تھی عرش صدیقی نے اسے اقبال کی طرح شعور اور COGNINATION کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا"۔

(ڈاکٹر اے .بی . اشرف)

آج کے دور انانیت میں عرش صدیقی ایک قابل احترام شخصیت کے حامل ہیں۔ اس کی وجہ یقیناً یہ نہیں کہ وہ اوروں کے تعصبات کو قبول کر لیتے ہیں، بلکہ انھوں نے دوسروں سے اختلاف رائے رکھتے ہوئے یہ مقام حاصل کیا ہے یہ مقام یقیناً انھیں اس لیے بھی حاصل نہیں ہوا کہ ان کا اسلوب یا ان کے جذبے بعض شاعروں اور ادیبوں کے لیے اتنے گلیمرس تھے کہ دوسروں کے لیے گریز بن جاتے۔ اس کی وجہ سے درحقیقت ان کا باوقار کردار اور ادب اور ادیب کے بارے میں ایک مخصوص رویہ ہے۔ ایسا رویہ جس کی تخلیق زندہ رہنے کا جواز بن جاتی ہے اور کوئی ایسا مشغلہ نہیں رہتی جس کے بغیر گزر ہو سکتی ہو"۔

(ڈاکٹر فاروق عثمان)

عرش صدیقی کی شاعری کو اس لیے زندہ رہنا ہے کہ اس میں ان کا زمانہ بولتا ہے۔ ان کے ہاں زندگی معنویت کے بغیر ممکن نہیں تھی اور فن جواز کے بغیر ادھورا تھا۔ انھوں نے ان دونوں سچائیوں کو اپنے فن کا حصہ بنایا۔ اور شاعری کی ایک لازوال وادی میں قدم رکھا۔ عرش صدیقی انسانی رویوں کے شاعر ہیں، ان کے تمام موضوعات انسانی سچائی اور ہم دردی کے ہیں۔ وہ جب موسموں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا تعلق فطرت کے اعتراف کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں سیاسی شعور کی موجودگی بھی اپنا احساس دلاتی ہے۔ اس میں نعرہ بازی ہے اور نہ ہی کسی خاص نظریے سے وابستگی کا اظہار ہے۔ لیکن ان کے فن کی تمام تر سچائیاں انھیں ایک

ترقی پسند اور انسان دوست شاعر کے طور پر ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ ایسا شاعر کہ جو لفظوں میں محبت تلاش کرتا ہے اور ایسا شاعر جو لوگوں کو محبت سے دیکھتا ہے۔ عرش صدیقی کی ساری شاعری محبت ہی کا پھیلاؤ ہے اور ان کی شاعری میں دور تک اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور باقی تمام موضوعات اسی گُل دان کے پھول ہیں۔

(جاوید اختر بھٹی)

عرش صدیقی زندگی اور فن میں توازن اور اعتدال پر یقین رکھتے ہیں۔ خیر کو وسطی اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ حسن بھی تناسب اور توازن کا نام ہے۔ شعری ہیئت کا حسن بھی توازن ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ عرش صدیقی نے جو رویہ اپنی زندگی میں اپنایا وہی روش شاعری بھی اختیار کی۔ انھوں نے اپنے فکر اور اس کے اظہار میں توازن برقرار رکھا۔ ان کی نظموں میں ان کا فکر اور اسلوب دونوں متوازن ہیں۔ جب توازن فکر و ہیئت میں شامل ہو تو وہ سراسر مجموعہ خیر ہے"۔

(ڈاکٹر محمد امین)

بنیادی طور پر عرش صدیقی ایک انسان دوست اور باشعور فن کار ہیں۔ وہ اپنے آئیڈیلز سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ اسی لیے اپنے مشاہدے کو مطالعے کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں تفصیل پسندی کے باوجود رقت قلبی کا مظاہرہ نہیں کرتے کیوں کہ مغربی ادبیات کے مطالعے نے ان کی فن کارانہ شخصیت کو تحمل اور توازن عطا کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے افسانوں میں انکے مطالعے کی بازگشت نمایاں ہو جاتی ہے۔

(ڈاکٹر انوار احمد)

عرش، زندگی کے آئینے پر ماضی کی دھول کی دبیز تہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ انکے نزدیک پرانی نسلوں کی قبروں کے نشان قائم رکھنے اور ان پر بیٹھ کر مجاوری کرنے سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ زندگی کے عصا سے ماضی کی دیمک جھاڑ کر اس کے سہارے مستقبل کے نیل میں راستہ بنایا جائے۔ بزرگوں کی دی ہوئی صحت منداور جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ روایات کے

سہارے اپنے حال کو روشن تر بنایا جائے۔ عرش اگلی نسل کو اپنی قبر کی مٹی کی نہیں، توانا تہذیبی عناصر کی حفاظت کی ذمہ داری سونپنا چاہتے ہیں''۔

(ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی)

عرش صدیقی کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک ہی جست میں ان کے معنی کی تہوں تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اور کئی بار پڑھنا پڑتا ہے اس لیے عرش صدیقی نے نہایت سخت محنت اور جاں فشانی سے اپنے برسوں کے خیالات کو نظم کیا ہے اور اس کو لمحۂ موجود کی مناسب شکل دینے کے لیے کتنی تبدیلیاں کی ہیں۔ یوں وہ مجھے روما کے شاعر ورجل کے مانند نظر آتے ہیں جو صبح کو اپنے اشعار لکھواتا تھا اور دن بھر ان پر غور کرتا تھا اور ان کو چھانٹتا تھا اور یہ بات کہا کرتا تھا کہ ریچھنی بھی اس طرح اپنے بدصورت بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوب صورت بناتی ہے''۔

(ڈاکٹر طاہر تونسوی)

انگریزی شاعر ہاپکنس کی طرح عرش صدیقی اردو شاعر کی جدید روایات سے انحراف کر کے ایک ایسے شعری اظہار کی جستجو میں سرگرداں نظر آتے ہیں جس میں اختصار، سوز، شدت احساس اور صداقت ہو۔ خواہ اس عمل کے دوران زبان کو ایک حیرت آمیز جدت سے کیوں نہ استعمال کیا جائے! مابعد الطبیعاتی شاعری کی طرح ان نظموں میں فکر واحساس کو بڑی خوب صورتی سے مدغم کیا گیا ہے۔''

(محمد افسر ساجد)

دور جدید میں جب کہ شاعری انکشاف ذات کے نام سے اکفائے ذات یا پھر کسی ازم کے پرچار کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے اور کسی شاعر کی شاعری یا تو صرف اس کے اپنے لیے ہے یا اس کی جماعت کے لیے ہے تو ایسے میں عرش صدیقی کا وجود اس لحاظ سے غنیمت ہے کہ حیات وکائنات کے بارے میں متوازن اور سنجیدہ انداز میں غور وفکر کر کے شعر کہہ رہے ہیں۔ اور انھیں اپنے فکری نتائج سے شدید جذباتی لگاؤ بھی ہے۔ جو ایک سچے شاعر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر

عرش صاحب کی شاعری ایک شدید جذباتی اور گہرے عالمانہ کرب کی شاعری ہے۔ان کا ذہنی اور جذباتی ادراک انھیں ایک ایسے موڑ پر لایا ہے جہاں کسی شے کی حقیقت واضح اور نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتی ۔اور وہ قوائے شعور کی نیم ادراکی سے بے قرار ہو جاتے ہیں۔چنانچہ ایک کرب مسلسل،ایک مستقل تڑپ اور تلملاہٹ ان کی شاعری کی روح رواں ہے۔"

(یحییٰ امجد)

ڈاکٹر عرش صدیقی نے نثری رائے زنی خط اور مختصر تبصروں سے شروع کی تھی اور کوئی خاص اسلوب تحریر ابھر کر سامنے نہ آیا تھا۔البتہ وقت کے ساتھ ساتھ جلد ہی انھوں نے اپنے حاسۂ انتقاد میں مجلسی تنقید سے کشیدہ کردہ انداز کو شعور کی رو سے وابستہ کر کے وہ اصول وضع کر لیے جن سے کام لے کر وہ ایک صاحب اسلوب و انداز تنقید نگار کے طور پر ابھرے"۔

(ڈاکٹر شوذب کاظمی)

عرش صدیقی کے ہاں موضوعات کی یکسانیت نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ ہمیں بڑا صحت مند تنوع ملتا ہے۔زندگی اور ماحول کے مسائل کے ادراک اور ان کے فلسفیانہ تجزیے سے انھیں گہری وابستگی ہے۔ان کے افسانوں پر جنی مسائل کا گہرا پرتو نظر آتا ہے۔جس کے بعد ثانوی اہمیت وہ بھوک اور اس سے جنم لینے والے مسائل کو دیتے ہیں۔اور ظاہر ہے کہ جنس اور بھوک دونوں وہ عظیم اشتہائیں ہیں جو جہانِ آب و گل اور جہانِ باطن میں تمام تر ہنگامہ آرائی کا موجب ہیں۔ عرش صدیقی ان دونوں جہانوں کے ارتباط،اشتراک اور تصادم کا خاصا شعور رکھتے ہیں"۔

(گلزار وفا چوہدری)

وہ اچھا شاعر،نام اور افسانہ نگار اور بڑا انسان ـــ۔اس کا مطالعہ بہت وسیع عالمی ادب کے ہر رجحان سے باخبر،معتبر رائے۔پہلی ہی ملاقات میں تسخیر کرنے والا،دل موہ لینے والا عرش صدیقی واقعی عزت کے لائق آدمی ہے۔

(رحیم گل)

عرش صدیقی کے فن کی اہم ترین خصوصیت ان کے ہاں امیجری کا مہارت کے ساتھ استعمال ہے۔ منظر کشی کا خوب صورت اسلوب ان کے ہاں ایک خارجی حسن پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ جذبات کی براں گیختگی کے حوالے سے پس منظری مطالعے کا کام بھی دیتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں کسی نجات دہندہ کے منتظر دکھائی دیتے ہیں۔ اظہار کے لیے وضع کردہ خاص لہجہ عرش صدیقی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

(محمد افتخار شفیع)

عرش صدیقی کی نظموں میں نفی کا استفہامیہ انداز نہ صرف نفی میں اثبات کا ابدی رنگ جما کر دل میں جاں گزیں ہو جاتا ہے بلکہ محبت کے حرکی تصور کو آگے بڑھا کر اگلی منزل کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے اور یہ اگلی منزل محبت کے ان دو آوارہ خرام کرداروں کو بالآخر اس دھرتی سے وابستہ کر دیتی ہے جو صرف "میں اور تو" طالب و مطلوب کے دو کرداروں کی آماج گاہ ہی نہیں ہے بلکہ ان کے آباؤ اجداد کی محبتوں کی جڑیں بھی اس دھرتی، اس عالم انسانیت کی سرزمینوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں"۔

(پروفیسر جمیل ملک)

عرش کی شاعری کی بدلتی اقدار سے متاثر ہیں۔ موجودہ اقدار کی تبدیلی کے سلسلے میں ایک فکر، ایک تقدس اور ایک تحقیق رجحان شعر کی صورت اختیار کرتا ہے۔ عرش رجعت پسند نہیں، وہ اس حد پر کھڑے سوچ رہے ہیں جہاں سے دونوں معاشروں کے خدوخال نظر آتے ہیں۔ اشعار کی سطح عوام سے بلند ہے۔ کتاب "دیدۂ یعقوب" شائع ہو چکی ہے جس میں عرش کے خدوخال دھندلے نہیں"۔

(احسان دانش)

ڈاکٹر عرش صدیقی کا منتخب کلام

اُسے کھنا

اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے
دسمبر کے گزرتے ہی برس اک اور ماضی کی گپھا میں ڈوب جائے گا
اسے کہنا دسمبر لوٹ آئے گا
مگر جو خون سو جائے گا جسموں میں، نہ جاگے گا
اسے کہنا، ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کُہرے کی دیواروں میں لرزاں ہے
اسے کہنا شگوفے ٹہنیوں میں سو رہے ہیں،
اور ان پر برف کی چادر بچھی ہے
اسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا
تو کیسے برف پگھلے گی!
اسے کہنا کہ لوٹ آئے!!

(محبت لفظ تھا میرا)

محبت لفظ تھا میرا

میں اس شہر خرابی میں فقیروں کی طرح دردر پھرا برسوں
اسے گلیوں میں، سڑکوں پر
گھروں کی سرد دیواروں کے نیچے ڈھونڈتا، تنہا
کہ وہ مل جائے تو تحفہ اسے دوں اپنی چاہت کا!!

تمنا میری بر آئی اک دن ایک دروازہ کھلا اور
میں نے دیکھا وہ شناسا چاند سا چہرہ،
جو شادابی میں گلشن تھا!
میں اک شانِ گدایانہ لیے اس کی طرف لپکا
تو اس نے چشم بے پروا کے ہلکے سے اشارے سے مجھے روکا
اور اپنی زلف کو ماتھے پہ لہراتے ہوئے پوچھا۔۔۔
کہو اے اجنبی سائل،
گدائے بے سروساماں
تمہیں کیا چاہیے ہم سے؟
میں کہنا چاہتا تھا۔۔۔ ''عمر گزری جس کی چاہت میں
وہی جب مل گیا تو اور اب
کیا چاہیے مجھ کو''!
مگر تقریر کی قوت نہ تھی مجھ میں!

فقط اک لفظ نکلا تھا لبوں سے کانپتا، ڈرتا،
جسے امید کم تھی اس کے دل میں بار پانے کی
''محبت'' لفظ تھا میرا
مگر اس نے سنا ''روٹی''!

(محبت لفظ تھا میرا)

نظم

بہار آئی تو اس نے ایک تحفہ تازہ پھولوں کا مجھے بھیجا
مرا دل جی اٹھا جیسے
کسی خوابیدہ بستی میں
نیا موسم اتر آئے!
مہک اٹھا مرا بوسیدہ کمرہ ان کی خوشبو سے
مرے بچوں کے چہروں پر بھی یہ تحفہ
شب تاریک میں تنہا ستارے کی طرح چمکا
اسے دکھ تو ہوا ہوگا
کہ میں نے شکریہ لکھا
نہ یہ پوچھا
کہ تیرا حال کیسا ہے؟
نہ مانگا میں نے گھر کی تیرگی میں چاند سا چہرہ
نہ یہ چاہا کہ وہ پیاسی نگاہوں کو دکھائے جھیل سا منظر
بہت ہی بے ادب تھا میں
کہ میں۔ بچوں کے سوتے ہی
اٹھا اور اس کے تحفے کو
گلی سے دور بیٹھے اجنبی کے ہاتھ بیچ آیا
کہ اس شب گھر میں گیہوں تھے، نہ چاول تھے

(دیدۂ یعقوب)

میری روشنی لوٹا دے

مسکراتی، دل نشیں، دل دار، ٹھنڈی شام نے
ایک دن چپکے سے ساری روشنی کو
ایک گٹھڑی میں سمیٹا، بائیں شانے پر دھرا، تیزی سے بھاگی
اور اک دریا کنارے جا رکی!
کیا سیہ دریا تھا، جس کا تھا کنارا بھی سیہ اور تیز بہتا، شور کرتا پانی بھی سیہ!
تیز دریا اک سمندر کی طرح تھا جو موج زن، اور کف بہ کف
ایسے لگتا تھا زمانہ شب کی تاریکی سے ہم آغوش تھا!
مسکراتی، دل نشیں، دل دار، ٹھنڈی شام اس دریا میں غوطہ زن ہوئی،
اور ساری کائنات بے کراں نظروں سے اوجھل ہو گئی!
اے مری ہم درد، میری مسکراتی شام میں شیدا ترا
زندگی کے نام اندھا پن کوئی تحفہ نہیں
روشنی سے تھامرا ہونا، تجھے معلوم ہے
تیرے رنگوں، تیری چھاؤں، تیرے ٹھنڈے لمس پر قربان میں
اپنے شیدا کو اندھیرے میں بھٹکنے کو نہ چھوڑ!
رات اے کم خواب کالی رات! میں تیرا رفیق
بارہا، برسوں تری تالیف میں جاگا ہوں تیرے ساتھ میں!
مانتا ہوں روشنی پر بے طرح بھاری ہے تو،
میں اندھیرے کے بدن میں، جاں کنی کے خوف میں ملفوف ہوں

مضطرب رکھتی ہے، دہشت بے بسی بے اختیاری کی مجھے،
میں تری قوت کا قائل ہوں، مجھے مت زیر کر
برتری تیری تو میری ذات کی کم مائیگی میں ہر طرح محفوظ ہے
التجا سن لے مری اور مجھ کو لوٹا دے مرے ہونے کی شاہد روشنی
اپنے گھر جانے کو میں بے تاب ہوں۔

(محبت لفظ تھا میرا)

دیکھتا کوئی نہیں

لو سویرا ہو گیا
جاگ اٹھی شہ زور مرغوں کی اذانوں سے فضا
ہر طرف پھیلی ہواؤں میں پرندوں کے چہکنے کی صدا
شہر لیکن نیند کی آغوش میں مدہوش ہے!
جاگتا کوئی نہیں!!
دوپہر کا گرم سورج سر کے اوپر آ گیا
پھر بھی سارا شہر محوِ خواب ہے
روشنی کے ہاتھ دروازوں پہ دستک دے رہے ہیں صبح سے
بند دروازے جو اندر سے مقفل ہیں، انھیں
کھولتا کوئی نہیں!
ایک چپ سوئی ہے ہر گھر کے در و دیوار پر
بولتا کوئی نہیں!
گہری تاریکی مسلط ہے فصیل شہر پر
دیکھتا کوئی نہیں

(محبت لفظ تھا میرا)

☆

ہم گھر ہی میں رہتے تو تماشا تو نہ ہوتے
یوں کشتۂ بیداد زمانہ تو نہ ہوتے

غم، دل پہ شکستِ طلب جاں کا ہے بھاری
مٹ جاتے تگ و تاز میں، پسپا تو نہ ہوتے

کھو جاتے کسی بادیۂ ہفت بلا میں
خلقت میں مگر راندۂ دنیا تو نہ ہوتے

دنیا سے جو رکھتے کبھی دنیا سے روابط
اپنے ہی زمانے میں یوں تنہا تو نہ ہوتے

ہو رہتے حرم کے تو جیے جاتے سکوں سے
بدنام رہ دیر و کلیسا تو نہ ہوتے

آوارہ مزاجی کی سزا خوب تھی، لیکن
پا بستۂ خاک لب دریا تو نہ ہوتے

جیتے ہیں تو سب کھل گئے اوصاف جہاں پر
مر جاتے تو اچھا تھا کہ رسوا تو نہ ہوتے

اونچا جو اٹھا رکھتے علم اپنی انا کا
اعلیٰ نہ سہی عرش، پہ ادنیٰ تو نہ ہوتے

(ہر موج ہوا تیز)

☆

آنکھوں میں کہیں اس کی بھی طوفاں تو نہیں تھا
وہ مجھ سے جدا ہو کے پشیماں تو نہیں تھا

کیوں اس نے نہ کی مجھ سے سر بزم کوئی بات
میں سنگِ ملامت سے گریزاں تو نہیں تھا

کیوں راستہ دیکھا کیا، اس کا میں سرِ شام
بے درد کا مجھ سے کوئی پیماں تو نہیں تھا

تھا دل بھی کبھی شہرِ تمنا سے مماثل
یہ قریہ ہمیشہ سے بیاباں تو نہیں تھا

شب بھر مری پلکوں پہ دمکتے رہے تارے
کل رات جشنِ چراغاں تو نہیں تھا

کیوں اس نے مجھے عظمتِ قرآں کی قسم دی
وہ رہ زنِ ایمان مسلماں تو نہیں تھا

کیوں مجھ سے توقع تھی اسے جاہ و حشم کی
میں بندۂ نادار سلیماں تو نہیں تھا

(ہر موج ہوا تیز)

☆

مانوس ہو گئے ہیں، اندھے پرانے گھر سے
باہر نہیں نکلتے ہم روشنی کے ڈر سے

سائے کی آرزو میں لپٹے ہوئے ہیں ہم سب
سنسان راستے میں آتش زدہ شجر سے

ہم خاک ہو کے بھی ہر موجِ ہوا سے الجھے
یعنی تری وفا کا سودا گیا نہ سر سے

کیا کیا نہ گل کھلیں گے کیا کیا نہ جشن ہوں گے
اس کشتِ آرزو میں بادل کبھی جو برسے

تیرے حضور تھے ہم اپنی نظر سے اوجھل
خود کو بھی آج دیکھا گر کر تری نظر سے

اب تک ہمیں گماں ہے صحرا پہ گلستاں کا
اک بار بے ارادہ گزرا تھا وہ ادھر سے

دل سکوں لٹا تو سر کیوں رہا سلامت
کیوں زندہ لوٹ آئے ہم عرش اس کے در سے

(ہر موج ہوا تیز) •

عادل اور فقیر

عادل بھر بھر جھولی جائیں، عدل سے تیرے یار
تو نے فقیر کو کیوں ٹھکرایا، جیسے تری سرکار

عادل عادل کہتے بیتے، دن، ہفتے اور سال
عادل تھا ازلوں کا بہرا، سنتا کس کا حال

اک تقدیر کی باگ ہلائے، ایک پھرے دل گیر
کہنے کو انسان ہیں دونو، عادل اور فقیر

کملی میں بارات

عادل خلقت شور مچائے، ہوا ہوئے سنجوگ
نفرت کے دشمن ٹکڑوں میں، بٹے ہوئے ہیں لوگ

حاکم اور محکوم سبھی کو، ہے اس گھر کی تلاش
جس پر سایہ فگن ہو، غم خواری کا آکاش

میرے پاس علاج ہے اس کا، سنو فقیر کی بات
کالی کملی اوڑھ لو سارے، کملی میں بارات

اپنے اندر جھاتی پا

ڈگدا مردا میں گھر آیا تے اوہ بوہا، جو میں کھلا
چھڈ کے گیا سی،
اک گیانی دے ہونٹھاں وانگوں بند پیا سی!
تے بوہے دا باہر لا کنڈا اجے پیا ہلدا سی

☆☆☆☆☆

میں گیانی دے ہونٹھاں اُتے، اپنا سجا ہتھ رکھیا، تے
بوہے دے پٹ کھل کے مینوں واجاں مارن لگ پئے!
ڈردا ڈردا اندر لنگھیا، تے میں ویکھیا،
اوہ میرے بستر تے، اکھاں میٹ کے،
چٹی چادر اتے لئی!
تے اس چادر تے لکھیا سی
تو کملا ایں،
جو تیرے اندر وسدا اے،
اوہنوں توں کیوں گونگیاں گلیاں،
انھیاں سڑکاں،
بھکیاں راہواں وچ لبھناں ایں!
جے گیانی نوں اپنا کرن داتوں رکھنا ایں سچا چا،
میری گل نوں پلے بنھ،
تے اپنے اندر جھاتی پا!

Hasnain Sialvi

(کالی رات دے گھنگھرو)

ڈاکٹر عرش صدیقی کا سوانحی خاکہ

نام: محمد ارشاد الرحمٰن

قلمی نام: عرش صدیقی

پیدائش: 21 جنوری 1927ء گرداس پور (مشرقی پنجاب)

تعلیمی مدارج

میٹرک: لدھیانہ، 1943ء

ایف ایس سی (پری انجینئرنگ) لدھیانہ، 1945ء

بی۔اے: بطور پرائیویٹ امیدوار

ایم اے انگریزی: گورنمنٹ کالج لاہور، 1955ء

پی ایچ ڈی: ورلڈ یونیورسٹی اری زونا (امریکہ)، 1991ء

ملازمتی ذمہ داریاں

پروفیسر شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج ملتان (1955ء تا 1975ء)

چیئرمین شعبہ انگریزی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان (1975ء تا 1978ء)

رجسٹرار بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان (1978ء تا 1990ء)

اعزازات

1۔ آدم جی ادبی ایوارڈ

2۔ مولوی عبدالحق ایوارڈ

3۔ تاحیات فیلوشپ (اکادمی ادبیات پاکستان)

تصانیف

1۔ دیدۂ یعقوب (مجموعۂ شاعری)

2۔ باہر کفن سے پاؤں (افسانوی مجموعہ)

3۔ عرش صدیقی کے سات مسترد افسانے (مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی)

4۔ محبت لفظ تھا میرا (مجموعہ شاعری)

5۔ ہر موج ہوا تیز (مجموعہ شاعری)

6۔ کملی میں بارات (دوہوں کا مجموعہ عادل فقیر کے فرضی نام سے چھپا)

7۔ پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقا

8۔ تکوین (تنقید و تحقیق)

9۔ محاکمات (تنقید و تحقیق)

10۔ شعور، سائنسی شعور اور ہم (تنقید و تحقیق)

11۔ کالی رات دے گھنگھرو (پنجابی شاعری)

12۔ میرزا ادیب کے بہترین افسانے (مرتب)

13۔ سب رنگ (مرتب) ملتان ڈویژن کے ادباء کی منتخب تحریریں

14۔ امیر علی کی سرگزشت (ترجمہ)

15۔ شاخ نہال غم (جواں مرگ شاعر انوار انجم کا کلام۔ مرتب)

16۔ دریااور سمندر (تنقید و تحقیق)

17۔ دریااور سمندر (تنقیدی مقالات) زیرِ طبع

فن اور شخصیت پر ہونے والا تحقیقی کام

1۔ عرش صدیقی: شخصیت و فن
شوذب کاظمی مقالہ برائے ایم اے اردو
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان 1983ء

2۔ ڈاکٹر عرش صدیقی: حیات اور علمی و ادبی خدمات
ڈاکٹر شوذب کاظمی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان 2000ء

3۔ دنیائے ادب کا عرش: مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی 1999ء

ڈاکٹر عرش صدیقی نصاب میں

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

وفات

19 اپریل 1997ء
(آخری آرام گاہ: قبرستان نزد نشتر ہسپتال ملتان)

اس سوانحی خاکے کی تیاری میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مرتب کردہ کتاب ''دنیائے ادب کا عرش'' اور ملتان میں مقیم معروف ادیب جاوید اختر بھٹی کی فراہم کردہ معلومات سے مدد کی گئی ہے۔

حوالہ جات، کتابیات

ڈاکٹر عرش صدیقی کی کتابیں

1۔ دیدۂ یعقوب
2۔ باہر کفن سے پاؤں
3۔ عرش صدیقی کے سات مستر د افسانے، (مرتبہ) طاہر تونسوی
4۔ محبت لفظ تھا میرا
5۔ ہر موج ہوا تیز
6۔ کملی میں بارات
7۔ تکوین
8۔ محاکمات
9۔ کالی رات دے گھنگھرو

دیگر کتابیں

1۔ انوار احمد، ڈاکٹر، یادگار زمانہ ہیں جو لوگ، فیصل آباد، مثال پبلشرز، 2008ء
2۔ جابر علی سید، تنقید و تحقیق، ملتان، کاروان بک ڈپو، 1987ء
3۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل، 2005ء
4۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب سال بہ سال، لاہور، سنگ میل، 1988ء

5۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ملتان میں اردو شاعری، لاہور، سنگ میل، 1984ء
6۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، دنیائے ادب کا عرش، لاہور، مکتبہ عالیہ، 1999ء
7۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، دائرے اور لکیریں، لاہور، مکتبہ عالیہ، س ن

رسائل

1۔ افتخار شفیع، ''دسمبر کیا گیا'' ماہِ نو، لاہور، دسمبر 2005ء
2۔ افتخار شفیع، کالی رات دے گھنگھرو بارے ویروا، پنچم، لاہور، ستمبر 2006ء
3۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''محبت لفظ تھا اس کا'' اوراق، لاہور، 1997ء
4۔ جاوید اختر بھٹی، ''عرش صاحب کی باتیں اور یادیں''، القلم، فیصل آباد، 2001ء
5۔ مبین مرزا ''اک چراغ اور بجھا'' اوراق، لاہور، 1997ء
6۔ یحییٰ امجد، ''دیدۂ یعقوب کا شاعر'' شام و سحر، لاہور، 2007ء

اخبارات

1۔ پاکستان، لاہور (روزنامہ)، 20 اکتوبر 1995ء (ناصر بشیر سے مکالمہ)
2۔ میزان، ملتان (ماہنامہ)، اگست 1996ء
انٹرویو: (شناور اسحاق، مختار علی، افتخار شفیع، شعیب ابراہیم)
3۔ نوائے وقت، ملتان (روزنامہ)، 7 مئی 1997ء